اسرارِ اقبال



حسین مہدی رضوی

عاصم بہاری پبلیکیشنز، مراد آباد



ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب
نائب وزیر صنعت و رسد عامہ، حکومت ہند
صدر عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ، مراد آباد

اسرارِ اقبال

تبصروں کے ساتھ علاّمہ اقبالؒ کی مثنوی

"اسرارِ خودی" کا اُردو میں منظوم اور

معنوی ترجمہ

حسین مہدی رضوی

عاصم بہاری پبلیکیشنز
پیرزادہ اسٹریٹ
مراد آباد

نام کتاب ..... اسرارِ اقبال

سنہ اشاعت .... سنہ ۱۹۷۵ء

بارِ اول .... سات سو پچاس جلدیں

مصنف کا نام .... حسین مہدی رضوی

ناشر .... عاصم بہاری پبلیکیشنز

پیرزادہ اسٹریٹ۔ مراد آباد

مطبع .... ناظم پریس رامپور

دوسرا اڈیشن۔ ۷۶ء ———— دو ہزار

قیمت فی جلد .... گیارہ روپے



اقبال اور عاصم بہاری

آزادیٔ وطن پر قلم اٹھانے والا مورخ مولانا عاصم بہاری کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک طرف مولانا کی جنگ آزادی میں دی گئی قربانیاں اور دوسری طرف آزاد ہندوستان کی تعمیر میں رنگ بھرنے کی وہ تمام کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں جو مولانا نے آل انڈیا مومن کانفرنس کے ذریعہ انجام دیں

مولانا ایک بلند پایہ مقرر اور ادب پرور انسان تھے۔ ادب سے ان کا تعلق ان کے نام "عاصم بہاری" ہی سے ظاہر ہے۔

اقبال کی فکر کے گہرے نقوش مولانا کی اس تحریک میں ملتے ہیں جس کی انہوں نے ابتدا کی اور جس کے نمایاں مقاصد میں سماجی عدم مساوات اور معاشی استحصال کے خلاف وہ مورچہ بند جنگ شامل تھی جسکی ہوک اقبال کے اس شعر میں ملتی ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

معاشی استحصال کے خلاف اقبال کے نعرۂ جہاد کو عملی تشکل دینے کے لیے مولانا نے عوامی طاقت کو منظم کیا اور اس نعرہ کو سودمند اور ٹھوس تشکل دینے کے واسطے گاؤں گاؤں قریہ قریہ سفر کرتے رہے۔ اور جب اقبال فلسفۂ خودی کا درس دیتے دیتے آغوشِ لحد میں چلے گئے تو یہ مردِ مجاہد خودی کے اس درس کو عام کرتا ہوا عوامی جلسوں میں اپنے سحر آفریں انداز کو بروئے کار لانے میں منہمک نظر آیا جس کے نتیجہ میں یہ سحر آفریں انداز ہندوستان کے کروڑوں معاشی استحصال سے کراہتے لوگوں کے لیے باعثِ رحمت بن گیا اور ایک عوامی طاقت ابھر آئی۔ اقبال کے درسِ خودی کی یہ تفسیر وہ دعوتِ

عمل تھی جو ایک طرف تو ہندوستان کو تقسیم کرنے والی سامراجی اور سرمایہ دارانہ استحصال کی طاقتوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئی اور دوسری طرف ملک میں معاشی انقلاب لانے میں کروڑوں افراد کی معاون طاقت بنی ہوئی ہے۔ یہ وہی دھارا ہے جس کی رہنمائی مفکرِ ملت ضیاء الرحمٰن انصاری کر رہے ہیں۔

اقبال کی فکر اور مولانا کی عملی جدوجہد دونوں کی یکسانیت کا تقاضا عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ کی شکل میں پورا ہونا ایک قدرتی امر تھا جو آج آپ کے سامنے ہے۔

"اسرارِ اقبال" حسین مہدی رضوی صاحب کی وہ کاوش ہے جو اقبال کے پیغامِ خودی کو ہندوستانی عوام کے سامنے اردو میں عام کرنے کا ذریعہ بنے گی اور جسے عاصم بہاری پبلیکیشنز مطلعِ ادب پر لا رہا ہے۔

اس پبلیکیشنز بورڈ کی صدارت قبول کر کے محترم ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب ڈپٹی منسٹر حکومتِ ہند نے اپنی ادب پروری کا ثبوت دیا ہے جس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔ انشاء اللہ بورڈ اپنی کوششوں میں برابر منہمک رہے گا اور علامہ اقبال پر اپنی دوسری پیش کش بہت جلد منظرِ عام پر لانے والا ہے۔

عبدالماجد ادیب انصاری
سکریٹری
عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ ۔ مرادآباد

عاصم بہاری پبلیکیشنز اور "اسرارِ اقبال"

از جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب
نائب وزیر، صنعت و رسد عامہ حکومتِ ہند

صدر، آل انڈیا مومن کانفرنس

مولانا عاصم بہاری مرحوم ایک بلند پایہ مقرر۔ ایک قوم پرور لیڈر اور مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ستھرا ذوقِ شعری رکھنے والی ادب نواز شخصیت بھی تھے۔ مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کے مشن کو عوام تک پہنچانے کے لیے مراد آباد کے چند اہلِ فکر حضرات نے مولانا کے نام پر ایک ادارہ "مولانا عاصم بہاری میموریل سوسائٹی اتر پردیش" کے نام سے حکومت یو۔ پی سے رجسٹرڈ کرایا ہے جس کا پہلا قدم تعلیم کا فروغ ہے۔ اس کا ایک ذیلی ادارہ "عاصم بہاری پبلیکیشنز" بھی ہے جس کے مقاصد میں سنجیدہ ادبا و شعراء کی غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت شامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقاصد میں نمایاں کامیابی حاصل کریگا جناب محمد ظہیر انصاری اور مسٹر عبد الماجد ادیب انصاری جن کی مساعیِ جمیلہ اس ادارے کے قیام کا ذریعہ بنیں لائق مبارکباد ہیں۔

"اسرارِ اقبال" اس ادارے کی پہلی پیش کش ہے۔ یہ علّامہ اقبال کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی کے چھپتے ہی دنیا کو اس کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوگئی تھی اور اکثر زبانوں میں اس کے

ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی زبان میں اس کے ترجمے کی ضرورت کا احساس جناب حسین مہدی رضوی صاحب نے کیا اور اس کمی کو بخوبی پورا کر دیا۔ ان کی اس کوشش سے علامہ اقبال کی فارسی مثنوی اُردو کے قالب میں ڈھل کر ہمارے شعور کو دعوتِ فکر و نظر دے رہی ہے۔

علامہ اقبال ہندوستان کی اُن معدودے چند عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو اپنے ہم وطنوں کو خود نگر و خود گر و خود گیر رہنے اور عزتِ نفس کو محفوظ رکھنے کا سبق دیتے ہیں۔ وہ ایسی خودی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو کسی ایک منزل پر نہ ٹھہرے اور جس کی یلغار زمان و مکاں کے سارے حدود توڑ کر آگے بڑھ جائے۔ اُن کے نزدیک حقائق کی دنیا خودی کی منزلِ اولیں ہے جس کو نشیمن نہیں سمجھنا چاہیے اور اپنی یلغار جاری رکھنی چاہیے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا

وہ ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے بقول :-

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی — جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

لیکن جب ان کی نظر سیاستِ افرنگ اور مغربی طرزِ معاشرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان پر پڑتی تو ان کا احساس ایک خاص قسم کی گھٹن محسوس

کرتا اور وہ اپنے اہلِ وطن کے تعطل وجمود پر گریہ کرتے تھے۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

اُن کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی چنانچہ وہ جوشِ کردار کے ذریعہ جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس لیے کہ جس جماعت میں جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا ہو جائے جو اس کے جوشِ عمل کی آئینہ دار ہوتی ہے تو اس کے غلبہ و تسلط کو دنیا کی کوئی رکاوٹ نہیں روک سکتی۔ وہ اپنے جوشِ کردار اور اعمالِ صالحہ سے اپنی تقدیر کے راز معلوم کر سکتی ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

اسرارِ خودی اُن کی اس قسم کی مثنوی ہے جو دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور جس کے لیے ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا تھا کہ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر (اقبال) آزاد روح اور وسیع نظر رکھنے والے انسانوں کا سچا عاشق ہے نیز کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کہا تھا کہ اقبال کا جدید اور فیض رساں سرود عنقریب الہامی آواز کی حیثیت اختیار کرنے والا ہے مجھے بے حد مسرت ہے کہ عاصم بہاری پبلیکیشنز کے ذریعہ اقبال کی یہ آواز اسرارِ اقبال کے لہجے میں بلند ہو رہی ہے۔

(ضیاء الرحمٰن انصاری)

صدر۔ عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ، مراد آباد

۵ نومبر ۱۹۷۵ء

"سر محمد اقبال کی شاعری

آفاقی قدروں کی حامل ہے"

(گرو رابندر ناتھ ٹیگور)

"... بہر نوع اقبال کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے دُنیا کے غریبوں کو جگانے کے لیے جرس کا کام دیا اور فیض جیسے جانے کتنے نوجوان اس کے سہارے انقلاب کی راہِ راست پر آ نکلے ....."

(ڈاکٹر محمد اشرف)

جا سمہ

پیش لفظ

از علّامہ امتیاز علی صاحب عرشی

نوائے سروش اور صریرِ خامہ کارشتہ غالب جانیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدلان کی جس بے باک ترنگ نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ :۔

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

شاید اسی نے اقبال سے "اسرارِ خودی" تصنیف کرائی اور ماوراء النہری مغل بچے کے یہاں جو مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا وہ اس مستِ مئے حجاز کشمیری برہمن زادے کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا

تناسخ کے حوالے سے سر عبدالقادر نے خوب کہا تھا کہ غالب کی روح عالمِ بالا میں بے چین تھی اس لیے اقبال کی شکل میں پھر یہاں آگئی۔ غالب نہ ہوتے تو اقبال ڈھونڈے سے نہ ملتے اور اقبال نہ ملتے تو غالب نامکمل رہتے کیونکہ جو بندگی میں اتنے آزادہ و خود بیں ہوں کہ :۔

الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ زندگی میں کیسے نہ چاہیں گے کہ :۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن پر جو دیباچہ تحریر کیا تھا اس میں یہ وضاحت بھی کہ خودی اس مفہوم کی حامل اصطلاح نہیں ہے جو خود رائی اور خود ستائی جیسی اصطلاحوں میں پایا جاتا ہے، تو پھر خودی کیا ہے؟ کیوں ضروری ہے؟ اجمالاً اس کا جواب یہ حدیث ہے۔

من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ

(جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

اور تفصیل کے لیے اقبال کی دنیائے نظم و نثر میں سے اُن کی مثنوی "اسرارِ خودی" کلیدی حیثیت کی مالک ہے۔

اقبال کی اس تصنیف کو دُنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور شاید ہی کوئی اہم زبان ایسی ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ ایک عرصے سے اس کے اُردو ترجمے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ حسین مہدی رضوی صاحب نے صرف ترجمے ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس فارسی نظم کو اُردو مثنوی میں تبدیل کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مہدی صاحب پر اس جوئے شیر لانے میں کیا بیتی ہوگی اُس کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس مہم کے سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اقبال نے اسرارِ خودی کو فارسی میں لکھنے کی مصلحت یہ بیان کی تھی کہ:-

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است | طرزِ گفتار دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت | خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعت اندیشہ ام — درخورد با فطرتِ اندیشہ ام

معلوم ہوتا ہے کہ مہدی صاحب نے اس عزم کے ساتھ کام شروع کیا تھا کہ وہ اسمیں فارسی کی سی حلاوت پیدا نہ بھی کر سکے تو ترجمہ اردو کی شیرینی سے عاری نہ ہوگا۔ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نثر کا ہو یا نظم کا وہ سعیِ ناشکور کہلاتا ہے لیکن آپ مندرجۂ ذیل فارسی اشعار کیساتھ ان کا اُردو ترجمہ پڑھیئے:۔

راہِ شب چوں مہرِ عالمتاب زد	لٹ گئے جب لیلیٰ شب کے گہر
گریۂ من بر رُخِ گل آب زد	میرے اشکوں سے ہوئے گل خوب تر
اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست	میرے آنسو خوابِ نرگس لے اُڑے
سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رست	جاگ اٹھا سبزہ مری فریاد سے
بود نقشِ ہستیم انگارۂ!	میرا نقشِ ہستی اک انگارہ تھا
ناقبولے ناکسے ناکارۂ	ناقبول و ناکس و ناکارہ تھا
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم	عشق کی سوہان سے میں آدم ہوا
عالمِ کیف و کمِ عالم شدم	عالمِ کیف و کمِ عالم ہوا!
حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام	حرکتِ اعصابِ گردوں دیکھ کر
در رگِ مہ گردشِ خوں دیدہ ام	چاند میں بھی گردشِ خوں دیکھ کر
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست	راتوں انساں کے لیے رویا کیے
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست	زندگی کا راز آخر پالیا!
از درونِ کارگاہِ ممکنات	کھولا بابِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سرِ تقویمِ حیات	میں نے پایا سرِ تقویمِ حیات

خامہ ام از ہمتِ فکرِ بلند
رازِ ایں نہ پردہ در صحرا فگند
قطرہ تا ہمپایۂ دریا شود!
ذرہ از بالیدگی صحرا شود

فکرِ عالی سے قلم ہے تیز گام
رازِ نہ افلاک کھلتے ہیں تمام
تا کہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے!
ارتقا سے ذرہ بھی صحرا بنے

تمہید

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد!
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

بس خودی کا اک اثر ہے یہ شہود
اصلِ شے سرِ خودی کی ہے نمود
جب خودی نے خود کو چونکایا ذرا
عالمِ پندار ظاہر کر دیا
سو جہاں پنہاں ہیں اسکی ذات میں
اس کی ضد ہے اس کے ہی اثبات میں
اس نے یہ طرزِ جدل ایجاد کی
خود سمجھ بیٹھی ہے خود کو اجنبی

(اصلِ نظامِ عالم از خودی است....)

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز
آبروئے ملتِ بیضا مریز

حق کی ہمت پہ فلک کو آزما
سر نہ جھکنے پائے تیری قوم کا

(خودی از سوال ضعیف می گردد....)

از حقیقت باز بکشایم درے
با تو می گویم حدیثِ دیگرے
گفت با الماس در معدن زغال
اے امینِ جلوہ ہائے لازوال
ہمدمیم و ہست و بودِ ما یکیست
در جہاں اصلِ وجودِ ما یکیست
من بکاں میرم ز دردِ ناکسی !
تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی
قدرِ من از بدگلی بدتر ز خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک
روشن از تاریکیِ من مجمر است
پس کمالِ جوہرم خاکستر است

کرتا ہوں ظاہر حقیقت اک نئی
اب سناتا ہوں کہانی دوسری
کان میں ہیرے سے بولا کوئلہ
تو امیں ہے لازوال انوار کا
ہم ہیں ہمدم ایک ہی ہے ہست و بود
ایک ہے در اصل دونوں کا وجود
میں یہاں مرتا ہوں ٹھکرایا ہوا
تاجِ شاہی سے ترا رشتہ ہوا
قدر میں بہتر ہے مجھ سے مشتِ خاک
حسن سے تیرے دلِ آئینہ چاک
نورِ آتش داں ہیں میرے خال و خد
راکھ تک ہے بس مرے جوہر کی حد
(حکایتِ الماس و زغال ......)

گفت شیخ ایں زرِ حق سلطانِ ماست
آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست
حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است
شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است
دیدہ بر خوانِ اجانب دوختست
آتشِ جوعش جہانے سوختست

شیخ نے فرمایا درہم بخش دو
جامۂ شاہی میں اس کنگال کو
حکمراں افلاک و بحر و بر کا ہے
پھر بھی یہ مفلس زمانے بھر کا ہے
خوانِ پر غیروں کے ہیں نظریں لگی
بھوک سے اس کی یہ دنیا جل گئی
(مقصدِ حیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است ....)

علمِ حق را در قفا انداختی
بهر نانے نقدِ دیں در باختی
گرم رو در جستجوئے سرمۂ
واقف از چشمِ سیاہِ خود نۂ
آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب
از دہانِ اژدہا کوثر طلب

علمِ حق تیری نظر سے گر گیا
نقدِ دیں روٹی کی خاطر دے دیا
جستجوئے سرمہ میں ہے دربدر
اپنی آنکھوں کی سیاہی بھول کر
مانگ اب خنجر سے آبِ زندگی
اژدہے کے منہ سے کوثر کی نمی

(اندرز میر نجات نقش بند ....)

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

تخمِ ظلمت اپنے دل میں بو دیا
وقت کو بھی ایک خط سمجھا کیا
لے کے پھر پیمانۂ لیل و نہار
ناپنے بیٹھا ہے طولِ روزگار

(الوقتُ سیفٌ ....)

مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مہدی صاحب کے بہت سے اُردو اشعار کو قابلِ داد قرار دیں گے

کسی منظوم ترجمے کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ سب کا سب اصل متن کا ہم پلہ ہوگا ترجمے در اصل کے فرق کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ترجمہ بحیثیت مجموعی اصل کے اس پاس پہنچ جائے تو اُسے ترجمے کی خوبی کہا جائیگا۔ مہدی صاحب کے اردو متن میں یہ خوبی پوری طرح موجود ہے۔

اس منظوم ترجمے کی تمہید میں مہدی صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے وہ ترجمے سے کم اہمیت کا نہیں۔ اس تمہید کی مدد سے اقبال کی پوری فکری شاعری کو عموماً اور "اسرارِ خودی" کو سمجھنے میں خصوصاً بڑی مدد ملے گی

خدا کرے مہدی صاحب کی یہ سعی مشکور و مقبول ہو۔

امتیاز علی عرشی

۱۹ر مارچ ۱۹۷۵ء

معروضات و محسوسات

علامہ اقبالؒ کی نظم و نثر کے بارے میں اتنا لکھا اور کہا گیا ہے کہ اس پس منظر میں "اسرارِ اقبال" کے صحیح مقام کی نشان دہی مشکل ہے۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ صاحبانِ فکر و نظر اس کے ساتھ کیا معاملہ اور اقبال نواز اس سے کیا سلوک کریں گے

علامہ نے اسرارِ خودی کی تمہید میں کہا تھا کہ :-

خردہ بر مینا مگیر اے ہوش مند ۔۔۔ دل بہ ذوقِ خردۂ مینا ببند

(نکتہ چینی شکل مینا پر نہ کر ۔۔۔ لطف صہبا سے اٹھا، اے دیدہ ور)

میں بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اگر میری کوتاہیوں کو دیکھنے کے باوجود دیدہ وروں کی نظر موضوع سے نہ ہٹی تو فہم و فکر کو اچھی فال مل جائیگی۔ اس کتاب میں اسرارِ خودی کے تقریباً ایک ہزار اشعار کا معنوی اور منظوم ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے اور مقدمہ کے بطور ہر باب پر مختصر سا تبصرہ جو اسرارِ خودی کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

حواشی، ذیلی مندرجات کی شکل میں نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں پیش کیے گئے ہیں کہیں کہیں علامہ کے ان مصرعوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا جو اگر فارسی اشعار کے مصرعے نہ ہوتے تو اردو ہی کے سمجھے جاتے، انہیں واوین میں تحریر کیا گیا ہے شاید ۲، ۳ شعر ایسے ہیں جن کا ترجمہ ایک ایک شعر میں نہیں دو دو شعروں میں ہوا ہے

انہیں توسین میں لکھا گیا ہے۔

میں علامہ کے تصورِ خودی پر اب تک تین کتابیں مکمل کر سکا ہوں۔ مزید دو کتابیں بھی یعنی "رموزِ اقبال" (تبصروں کے ساتھ رموزِ بے خودی کا منظوم ترجمہ) اور "خودی۔ ایٹم سے اقبال تک" علامہ کے مخصوص طرازِ فکر "خودی" کو اجاگر کرنے کیلئے لکھی گئی ہیں جو انشاء اللہ جلد پیش کرنے کی کوشش کرونگا

معروضات ختم کرنے سے پہلے یہ اظہار کرتا چلوں کہ اس ترجمے کی ضرورت کیا تھی؟ آدمی کو کچھ بھی پہچاننے سے پہلے خود کو پہچاننا چاہیئے۔ یہ کام نہیں کارنامہ ہے جو آسانی سے انجام نہیں پاتا۔ ابنائے آدم نے آج تک اس سے زیادہ بعید از حقیقت بات کوئی اور نہ کہی ہوگی کہ "ہم خود کو پہچان چکے ہیں" معدودے چند کو چھوڑتے ہوئے دراصل ہم سب مرتے دم تک اپنی کارروائی شناخت میں منہمک رہتے ہیں لیکن کہنے سننے کے قابل ہوتے ہی سمجھنے لگتے ہیں کہ خود کو پہچان چکے ہیں۔ یہ خود فریبی نہیں تو کیا ہے؟ اب اگر حقیقت شناس ہونا فریب کھانے سے بہتر ہے تو خود شناس ہونا لازم جو خودی کی حقیقت سمجھے بغیر ممکن نہیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اقبال کی ان تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے جن کا منشا ہی خودی کی بلند بانگ تکرار اور اسکی ماہیت سمجھنے پر جائز اصرار ہے۔

آج سے دس بارہ برس پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اگر آدمی کو انسان بننا ہے تو اسے علامہ کے تصورِ خودی کو اپنانا ہوگا لیکن اس مشکل کا حل سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرے ہم وطن اس تصور کو کیسے اپنائیں گے جب کہ علامہ نے

خودی کے بارے میں مربوط ڈھنگ سے جو کچھ کہا ہے وہ فارسی یا انگریزی میں ہے۔ چنانچہ میں اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کے ترجمے کی طرف مائل ہوا اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا جس کی پہلی کڑی "اسلوبِ اقبال" کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

حرفے نزد او دو دانش و دین است ایں کہ ما

بہرِ نشاطِ خاطرِ دانا نوشتہ ایم

میں اپنے ان سب دوستوں اور رشتہ داروں کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔ ان میں میری بہن عارفہ سلمہا کے نام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ان حالات میں میری حوصلہ افزائی کی جو میرے حالات سے کہیں زیادہ پریشان کن اور صبر آزما تھے کچھ ایسے کہ ان میں آدمی کسی کی مزاج پرسی کرنا تو درکنار اپنا نام بھول جائے۔

اس وقت میرے سامنے ایک ایسے دوست کا چہرہ بھی ہے جو اردو نہیں جانتے تھے لیکن یہ کتاب دیکھنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اپنے انتقال سے ایک دن پہلے انھوں نے کہا تھا۔

"مہدی صاحب! ہم نہ اردو جانتے ہیں نہ اقبال کی فلاسفی۔ یہ کتاب ہمارے دوست کی ہو گی ہمیں تو بس اسی کی خوشی ہے۔"

میرے یہ دوست پنڈت کیدار ناتھ دوے ایڈوکیٹ تھے۔

کاش وہ اس کتاب کو دیکھ سکتے۔

حسین مہدی رضوی

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

سوادِ اسرار

اقبال کا تصورِ خودی

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود[1]

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے[2]

علامہ اقبالؔ کے تصوّر کے بموجب "خودی کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی"[۱] اس کی حقیقت مضمر ہے۔ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ کہنے کے علاوہ وہ اسے کہیں شرارِ زندگی اور کہیں نور کا نقطہ[۲] بھی کہتے ہیں۔ اُن کی بتائی ہوئی تعریف کے مطابق "خودی ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی ہے جو انسان اور کائنات کے دیگر افراد کو اُن کے کارہائے منصبی کی تکمیل کے لئے ارتقار کی راہ پر لگائے رکھتی ہے"[۳]

اقبالؔ کے بقول زندگی کی حقیقت تفرّد ہے۔ عالم گیر زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ افرادِ کائنات کی تعداد بھی معیّن نہیں بلکہ ہر روز نئے افراد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے[۴]۔

تخلیق کا سرچشمہ ایک وجودِ بسیط ہے جس میں ادراک اور ارادے کی معروف اور محکم قوتیں موجود ہیں۔ اُن کے نفاذ کے لئے وجود "خود" اور "غیر خود" میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ "غیر خود" کو "خود" کا آئینہ سمجھنا چاہیئے۔ جس میں "خود" اپنا نظارہ کرتا ہے اور یہی "غیر خود" وہ نصب العین بھی ہے جو خودی کی کارفرمائی کے لئے اس کے سامنے رہتا ہے...... اس کارفرمائی کے لئے سامنے رہتا ہے جو "خود" کو ارتقا کی طرف بڑھاتی ہے[۵]۔

تخلیق کا یہ سرچشمہ، یہ وجودِ بسیط ہی "خودی" ہے۔ یعنی وہ ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی جو کائنات انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے ہر فرد کی ہادی بھی ہے اور ناظم و نگراں بھی، اور یہی کائنات کے ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے۔

کارفرمائی کے اعتبار سے خودی کو انائیت کہا جاسکتا ہے جس کا ظہور دیگر افرادِ کائنات کی نسبت آدمی میں زیادہ نمایاں ہے۔

قدر آفریں انا اور مؤثر انا

اقبال کے بقول انائیت کے دو انداز ہیں۔ ایک قدر آفریں اور دوسرا مؤثر۔ مؤثر انداز وہ ہے جس کے باعث خودی، خارجی عالم سے ربط پیدا کرتی ہے۔ اس انداز کی حیثیت مکانی ہے۔ یعنی ہماری رواں دواں شعوری کیفیات پر عالم مکانی کے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں۔ ان واردات میں خودی اپنی معنوی وحدت برقرار رکھتے ہوئے مختلف احوال کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے۔ زمانی رخ پر انائیت کے اس عمل کا تعلق اس وقت سے ہے جس میں طوالت اور اختصار کا احساس موجود رہتا ہے۔ یہ زماں یا وقت ایک قسم کا خطِ مستقیم ہوتا ہے جسے مختلف ملے ہوئے مکانی نقطوں پر مشتمل سمجھنا چاہیے، لیکن اگر ہم شعوری تجربے کا اور گہرا جائزہ لیں تو ہمیں انائے قدر آفریں کا پتا ملتا ہے۔

انائے قدر آفریں کی نوعیت کیفی ہے۔ اس میں جو تغیر و حرکت پائی جاتی ہے وہ غیر منقسم ہوتی ہے اور اس میں زمانی تواتر بھی نہیں ہوتا۔ اس کا زمان دراصل ایک آن واحد ہے جس کو انائے مؤثر خارجی عالم سے واسطہ رکھنے کے باعث مسلسل منفرد آنات میں پیش کرتی ہے۔ جیسے ایک دھاگے

میں موتی پروئے ہوئے ہوں۔

انائے قدر آفریں کی نوعیت کیفی اور داخلی ہونے کے باعث اس کی وحدت کو اس بیج کے مانند تصوّر کیا جا سکتا ہے جس میں اس کی گزشتہ پشتوں کے وہ تجربے پوشیدہ ہوں جو اپنی گوناگونی کے باوجود ایک وحدت سے عبارت ہوتے ہیں اور ہر تجربہ کُل میں اس طرح سرائت کئے ہوتا ہے کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

درجاتِ انفرادیت

اس تصوّر کو اپنا لینے کے بعد کہ "ہر شے انفرادیت کی حامل ہے" یہ مرحلہ فکر سامنے آتا ہے کہ بہ ہمہ صحت اظہار "فرد" کسے کہا جائے۔ برگساں نے اپنے نظریہ "ارتقائے ظہوری" میں بتایا ہے کہ انفرادیت دراصل درجات کا معاملہ ہے، کیوں کہ اس کی مکمّل شناخت تو وجودِ انسانی جیسے "واحدہ سر بستہ" میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اس فلسفی کے بقول انفرادیت کے بارے میں بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ عضوی طور پر منظّم کائنات میں منفرد رہنے کی صلاحیت ہر جگہ پائی جاتی ہے جس کی دائمی حریف "باز آفرینی" ہے اور باز آفرینی کیا ہے؟ پرانے جزو سے کسی نئے جزو کی تعمیر، مگر انفرادیت کی تکمیلیت کے لئے تو ضروری ہے کہ وجود کا کوئی ٹوٹا ہوا حصّہ الگ زندہ نہ رہ سکے۔

اس مقام پر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ انفرادیت اپنے دشمن یعنی بازآفرینی کو اپنی ہی گود میں پروان چڑھاتی ہے لیے

اب چونکہ خودی کا کرداری یہ ہے کہ وہ اپنے مرکز سے بڑھ کر بیرونی رُخ پر پھیلاؤ اختیار کرے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ "حیاتِ انائیت" قدر آفرینی سے موثریت کی طرف حرکت سے عبارت ہے لہٰذا خودی جیسے جیسے اپنے مرکز سے دور ہٹتی جاتی ہے، بے شمار درجاتِ انفرادیت بہمہ متعلقات عمومی و خصوصی رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایں ہمہ خودی کی مربوط کلیت ختم نہیں ہوتی۔ اسے سمجھنے کیلئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اگر ہم تخلیق کی حرکت کو باہر سے دیکھیں یا اس کا ذہنی تجزیہ کرنا چاہیں تو ہزارہا سال درکار ہوں گے، جن میں بے شمار درجاتِ انفرادیت سامنے آئیں گے، لیکن اسی عملِ تخلیق کو جب ایک "امر" کے بطور سمجھا جائے گا تو یہ ایک غیر منقسم عمل معلوم ہوگا۔ جو اس قدر تیزی سے انجام پاتا ہے جیسے پلک کا جھپکنا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھا جائے کہ طبیعیات کے رُو سے ہم جانتے ہیں کہ ہمیں سُرخ رنگ کا احساس اس کی حرکتِ موجی کی تیزگی کے باعث ہوتا ہے جس کا تعداد ایک سیکنڈ میں چار سو کھرب ہے۔ بیرونی طور پر اگر ہم اس کا شمار کرتے بیٹھیں اور دو ہزار فی سیکنڈ یعنی ادراکِ نور کی حد کے مطابق گنتا جاری رکھیں تو یہ شمار چھ ہزار برس سے بھی زیادہ میں ختم ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمیں سُرخ رنگ کا احساس آنِ واحد میں ہو جاتا ہے اور بے شمار ارتعاشات ایک ساتھ ایک آن کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ بس یہی وہ انداز ہے جس سے ذہن، زمانِ متواتر کو دورانیے میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں انائے قدر آفریں، انائے

مؤثر کی کوتاہیوں کو دور کرتے ہوئے زمان و مکاں کے تغیرات کو شخصیت کی مربوط کلیت میں تبدیل کر دیتی ہے[۱۹]۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اپنے مرکز میں خودی کا درجہ ایک قدر آفریں اور معیّن وجود کے بطور ہے جس کے منفرد ہونے کا احساس ہمیں کائنات میں نیچر کے توسط سے اور اپنے شعور میں ذہن کے ذریعہ ہوتا ہے۔ برگساں کے بقول "جب میں اپنے شعوری مشاہدے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک حالت سے گزر کر دوسری میں پہنچتا رہتا ہوں۔ میں ٹھنڈا ہوتا ہوں یا گرم، خوش ہوتا ہوں یا افسردہ۔ کام کرتا ہوتا ہوں یا بے کار۔ اِرد گرد کے نظارے میں منہمک ہوتا ہوں یا کسی خیال میں محو۔ احساسات، جذبات، ارادے، خیالات کچھ ایسے تغیرات ہیں جن میں میرا وجود بٹا ہوتا ہے اور جو میرے وجود کو یکے بعد دیگرے رنگتے رہتے ہیں۔ میں بدلتا رہتا ہوں، لیکن مٹتا نہیں۔ میری داخلی زندگی میں اگرچہ ساکن کچھ بھی نہیں بس ایک دائمی بہاؤ ہے۔ ایک مستقل روانی یا احوال کا جاریہ تغیرات ہے، لیکن میں اس عالم میں تقسیم نہیں ہوتا۔ میرا کوئی جزو مجھ سے ٹوٹ کر الگ زندہ نہیں رہتا کہ میری متکملیت کا نقص بنے بلکہ مجھ میں ہی موجود رہتا ہے[۲۰]۔ بالکل اسی طرح جیسے ایٹم کے قلب میں کوئی شے کبھی نہیں ٹوٹتی، کبھی تقسیم نہیں ہوتی صرف بدلتی ہے اور کچھ ایسے کہ ابھی بدلی اور ابھی پھر وہی کی وہی ہو گئی۔ گویا پلک کی جھپک کہ ابھی آنکھ نابینا تھی اور ابھی بینا ہو گئی بلکہ اس حقیقت کے بلیغ اظہار کے لئے خداوندِ دو عالم کا یہ قول دہرانا ہی بہتر ہے

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝[۲۱]

(یقیناً ہم نے ہر شے ایک قدر کے مطابق خلق کی اور ہمارا امر بس ایک ہے۔
جیسے پلک کا جھپکنا۔)

خدا، خودی اور آدمی

خدا بھی فرد ہے اور یکتا ہے۔[1] اس فردِ یکتا کی خودی، اساسی اور قائم بالذات ہے۔[2] قرآن مجید اس کے تشخص کو ذہن نشین کرانے کے لئے اسے اللہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کی تعریف اس طرح بیان کرتا ہے :۔

کہہ ! وہ اللہ ایک ہے۔
اللہ بے نیاز ہے
اس سے کسی کی ولادت نہیں ہوئی۔
نہ اس نے کسی سے ولادت پائی
اور کوئی اس جیسا نہیں ہے[3]

اس بے مثل ذات کی خودی اور کائنات کی خودی میں کوئی مشابہت نہیں ہے کیوں کہ :۔

خداوند تعالےٰ ہمیشہ سے موجود ہے، مگر حادث و نو پید نہیں۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے، لیکن بطور ہمسر نہیں۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے، لیکن اس سے کنارہ کش نہیں۔ وہ ہر چیز کا فاعل ہے، لیکن اس کا فعل حرکات و آلات کا نتیجہ نہیں۔ وہ بصیر ہے جب اس کی مخلوق نہ تھی۔ وہ منفرد ہے کیوں کہ اس کا کوئی ساتھی ایسا نہیں جس سے وہ اپنا جی بہلائے

اور جس کے نہ ہونے سے اُسے اُلجھن ہو۔ اُس نے دنیا کو پیدا کیا اور پہلے پہل بنایا بغیر اس کے کہ فکر کو کام میں لاتا یا تجربے سے فائدہ اُٹھاتا۔ نہ اپنے نفس میں حرکت پیدا کی اور نہ پہلے سے کوئی اہتمام کیا جس کے لیے بے چین ہوا ہو۔ وہ چیزوں کو ٹھیک وقت پر عدم و نیستی سے وجود کی طرف لایا اور گوناگوں چیزوں میں موافقت پیدا کی۔ ہر چیز کو اس کی طبیعت اور مزاج عطا کیا اور اُن طبائع کے لئے شکل و صورت معیّن کی۔[۱]

لاریب وہ یکتائی کے اعتبار سے "احد" ہے کیوں کہ اس کی ذات کو صفات سے بھی نہیں ملایا جا سکتا[۲] اور درجاتِ انفرادیت کے اعتبار سے "اعلیٰ" ہے کیوں کہ اس کے مرتبے سے بلند مرتبہ کسی کا نہیں۔ خدا کی خودی اور کائنات کی خودی میں کوئی مشابہت نہیں کیوں کہ انائے قدر آفریں کے مزاج میں تغیر و تبدّل کے کرشمے نظر آتے ہیں، لیکن خدا متغیر نہیں ہوتا[۳] اور انائے موثر کی خصوصیت تفریق و تقسیم ہے جس کے باعث بے شمار درجاتِ انفرادیت ظہور پذیر ہوتے ہیں، لیکن خدا کی ذات اس سے ماورا[۴] ہے۔ نیز انائے موثر اور انائے قدر آفریں جو علی الترتیب زمانِ متواتر اور زمانِ خالص یا دوراں سے علاقہ رکھتی ہیں، دونوں کا مزاج سیمابی ہے اور ان میں اضطراب پایا جاتا ہے (کیوں کہ برگساں کے بقول زمانِ خالص بذاتِ خود ایک مسلسل جاریہ تغیرات ہے) لیکن اللہ کبھی مضطرب اور بے چین نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ زمانِ متواتر کہا جا سکتا ہے نہ زمانِ خالص بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ خود اسی کے امر سے نمودار ہوا ہے[۵] کچھ اس طرح کہ اس میں ایک تخلیق پرور

باہوش قوتِ ارادی موجود تھی یعنی وہ قوتِ ناظمہ جو زمانِ خالص کو ایک مسلسل جاریہ تغیرات ہونے کے باوجود پراگندگی سے بچاتی رہی۔ وہ ایک انائے قدر آفریں تھی جو اپنے مرکز یعنی قلب زمانِ خالص سے بڑھ کر جب باہر پھیلنے لگی تو زمانِ متواتر کے ہم دوش انائے مؤثر کے بیشمار کرشمے نظر آنے لگے۔ کائنات انگیزی کی ابتدا ہوگئی اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق، بے شمار افراد اس قوت کے قدر آفریں اور مؤثر انداز لئے ظہور پذیر ہونے لگے جنہیں یہ کائنات انگیز قوتِ ناظمہ "خودی" اپنے اپنے کارہائے منصبی کی تکمیل کے لئے اس طرح راہِ ارتقا پر لگائے رکھتی ہے کہ :-

دما دم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر مگر ہے کہیں بے چگوں بے نظیر

اور اسی کے باعث :-

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[1]

لیکن حقیقت یہی ہے کہ :-

خودی را از وجودِ حق وجودے خودی را از نمودِ حق نمودے[2]

جہاں تک آدمی کی حیثیت کا تعلق ہے جانداروں میں یہی وہ جاندار ہے جو انفرادیت کے بہت ہی اونچے درجے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت اور حقیقت کا بھرپور شعوری احساس بھی رکھتا ہے[3]۔ مادی اور روحانی اعتبار

سے یہ ایک خودگیر مرکزہ ہے، لیکن ابھی تک مکمل فرد نہیں بن سکا۔ یہ کسی حد تک آزاد ہے اور کسی حد تک پابند۔ اسے مکمل آزادی تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب یہ آزاد ترین فرد یعنی اللہ کا قرب حاصل کرلے۔ اللہ اور آدمی میں جتنا فاصلہ ہوگا آدمی اتنا ہی نامکمل فرد ہوگا لہ لیکن اللہ کے قرب سے مراد واصل بحق ہوتا یا اللہ میں جذب ہو جانا نہیں ہے۔ کیوں کہ آدمی کا معاملہ تو یہ ہے کہ انائے محدود یعنی آدمی حشر کے روز بھی اپنی انفرادیت کے امتیاز کے ساتھ ہی انائے لامحدود یعنی اللہ کے سامنے اپنے اعمالِ گزشتہ کے نتائج کا مشاہدہ کرے گا لہ

الیغو

آدمی کی خودی یا شخصیت

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں — باقی ہے نمودِ سیمیائی لہ

فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے الیغو ہے لہ جس کی فطرت یہ ہے کہ وہ دوسرے الیغو سے دوبدو ہونے

کے باوجود اپنی ذات ہی کو اپنا مرکز بنائے رہتا ہے اور اپنے لئے انفرادیت کا وہ ذاتی حصار قائم رکھتا ہے جس کے باعث دوسرے تمام الیغو اُس سے دُور ہٹے رہیں[۱] دراصل الیغو کی زندگی ایک قسم کی حالتِ کشیدگی[۲] کا نام ہے جو الیغو اور اس کے گرد و پیش کی معرکہ آرائی سے پیدا ہوتی ہے[۳] اس کشیدگی سے امتیاز اور امتیاز سے انفرادیت کا خاکہ اُبھرتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو کسی بھی جان دار کی حقیقت اور حیثیت کے اندازے کا معیار وہ درجہ ہے جس کی امتیازی انائیت کا احساس اس جان دار کو ہو۔ اقبال کے تصوّر کے بموجب صرف وہی حقیقتہً موجود ہے جو "من ام (میں ہوں)" کا اظہار کر سکتا ہے لہٰذا پیمانۂ وجود پر کسی کا مرتبہ اس میں "من امیت[۴]" کے وجدانی احساس ہی کے باعث مقرر ہو سکتا ہے، یہی انفرادیت کے اندازے کا معیار ہے۔

آدمی میں انفرادیت گہری ہو کر شخصیت بن جاتی ہے[۵] کیونکہ شخصیت آخر ہے کیا؟ ایک علیحدگیّت (امتیازیت)، قوتِ ارادی اور کردار کی ایک مخصوص حالت کا نام ہی تو شخصیت ہے[۶] جو آدمی نے حیات سے معاملہ برداری کے دوران حاصل کی ہے۔

حیات بذاتِ خود آگے بڑھتی ہوئی اس حرکت کا نام ہے جو بہت کچھ جذب کر سکتی ہے اور اپنے سفر کے دوران راستے کی تمام رکاوٹوں کو چاٹ جاتی ہے۔ یہ سفر کے مختلف مرحلوں پر مسلسل نت نئی آرزوئیں اور معیار پیدا کرتی رہتی ہے[۷] جن کی وجہ سے ایک مستقل کشیدگی کی سی کیفیت

ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ایک تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ آدمی کے باب میں شخصیت اسی حالت کا نام ہے جو اُسی وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک یہ کشیدگی یا تناؤ باقی رہے۔ اس حالت کے ختم ہوتے ہی آسودگی لاحق ہو جاتی ہے۔ اب چوں کہ شخصیت یا حالتِ کشیدگی آدمی کی سب سے گراں قدر یافت ہے لہٰذا اسے حالتِ آسودگی کی طرف نہیں جانا چاہیئے، کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ جس میں کشیدگی برقرار رکھنے کا میلان پایا جاتا ہے بس وہی ہمیں باقی رکھنے پر مائل ہے[۱]

قرآن مجید کے اشارات کے بموجب آدمی آزاد شخصیت کا امین ہے اور اس نے یہ امانت جملہ مصیبتوں کے اندازے اور احساس کے باوجود قبول کی ہے[۲] چنانچہ آدمی کے لئے دائمی اجرِ الیغو کے لبطور اس کی بے مثالیت، خود گیری کے بتدریج ارتقا اور فعالیت کی شدت پر مشتمل ہے۔

اقبال کے نقطۂ نظر کے بموجب فرد کو چاہیئے کہ وہ دنیا کی تمام مادی قوتوں اور ان کے مظاہرات نیز تمام کلچرل محاصلات اور روحانی فتوحات کو ساتھ لیتے ہوئے انا کا مکمل اثبات اور اس کی بھرپور نشو و نما کرے اور یہ حقیقت بھی سامنے رکھے کہ انا جو ہمیشہ ترقی پانے کی طرف مائل رہتی ہے، ابھی تک نا آزمودہ قوتوں اور ماورائے قیاس امکانات کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ فرد اپنے آپ کو ہر قسم کے تعمیری اور معیاری طلب تجربات کے لئے پیش کرے۔ اگر وہ جد و جہد سے گریز کریگا تو اس کی انفرادیت افسردہ و مضمحل ہو جائے گی اور اس کی قوتیں بروئے کار نہ آسکیں گی[۳]

کیوں کہ انفرادیت کی نشو و نما ایک ایسا تخلیقی فعل ہے جس میں آدمی کو عملی طور پر حصہ لینا چاہیئے۔ یعنی اُسے کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ فعال رہ کر اپنے گرد و پیش پر قابو پانا چاہیئے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جس کے رُو سے فرد انفعالی کردار کے ساتھ مجہول طور پر اپنے آپ کو جامد ماحول کے مطابق ڈھالتا چلا جاتا ہے ۔ ۵۳

کرۂ ارض پر آدمی کا ایغو ایک معین دو رُخے منصوبے کا حامل ہے۔ ایک طرف تو یہ اپنے ماحول سے معرکہ آرا ہو کر اسے مسخر کرتا ہے اور اس تسخیر کے ذریعہ آزادیاں حاصل کرتا ہوا آزاد ترین فرد یعنی اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اسے کشیدگی کی حالت بھی برقرار رکھنی ہوتی ہے جس کے باعث وہ حصولِ لقا کا اہل قرار پاتا ہے۔ حصولِ آزادی و لقا کے باعث ایغو ایک طرف تو تسخیرِ مکاں کرتا ہے اور دوسری طرف تسخیرِ زماں۔

ایغو کے اس دو رُخے منصوبے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ایغو کو انسانیت کے سفرِ صعودی میں اس حد تک معاونت کرنا چاہیئے کہ بلند ترین انسان، فوق البشر یا مردِ کامل ظاہر ہو جائے، وہ جو حیات کی تمناؤں کا معیار ہے۔

اس اعتبار سے اقبال کے تصورِ خودی کو آدمی کے سہ رُخے ارتقاء پر مکمل یقین کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے ۵۵

لیکن یہ ارتقاء کیسے ممکن ہے؟

جواب ہے "شخصیت کو مستحکم کرنے سے" آدمی کو بس وہی اختیار کرنا چاہیئے جو شخصیت کو مضبوط بنا سکتا ہے اور وہ سب کچھ نظر انداز کر دینا چاہیئے جس سے شخصیت کمزور ہوتی ہے۔ اقبال کے خیال کے بموجب شخصیت کا تصور

تدبروں کا ایک معیار پیش کرتا ہے اور مسئلۂ خیر و شر کو اس طرح حل کر دیتا ہے کہ بس وہ جو شخصیت کو مستحکم کرے خیر ہے اور باقی شر، لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ شخصیت کا محلِ قرار ہی وہ کسوٹی ہے جس پر آرٹ، مذہب اور اخلاقیات کی جانچ ہونی چاہیئے۔ ل

شخصیت کے دوست اور دشمن

اقبالؔ کے بقول، حسبِ ذیل محرّکات جو آدمی کو خود نگر و خود گر و خود گیر بناتے ہیں اس کی شخصیت کے دوست ہیں۔

(۱) عشق (۲) فقر (مادی انعامات سے بے نیازی اور خود کو اُن سے برتر سمجھنا)، (۳) صبر (۴) شجاعت (۵) کسبِ حلال (جائز کمائی) اور (۶) حقیقی اور تخلیقی فعالیت میں حصّہ لینا ۲ہ

نیز وہ محرکات جو شخصیت کی کمزوری کا سبب بنتے ہیں، اس کے دشمن ہیں اور مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) خوف (۲) سوال (۳) غلامی (۴) نسب پرستی ۳ہ

شخصیت کو مضبوط بنانے والے محرّکات سے تعاون اور اسے کمزور کرنے والے محرّکات سے اجتناب کے باعث الیعو قوی سے قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس ارتقائی عمل کے دوران اُسے جو مرحلے طے کرنے چاہئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مرحلۂ اطاعتِ آئینِ الٰہی (۲) مرحلۂ ضبطِ نفس اور (۳) مرحلۂ نیابتِ الٰہی ۴ہ

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ خودی کا مکمل شعور اور اُس سے بخوبی فیض یاب ہونا اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک زمان و مکاں کی حقیقت نہ سمجھ لی جائے کیوں کہ جہاں مطمح نظر یہ ہو کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے وہاں زمان و مکان کا سوال زندگی اور موت کا سوال ہے[1] لہٰذا ہر فرد کو روحِ عصر کے اشارے سمجھ کر اور شخصیت کے دوست دشمن پہچانتے ہوئے اپنی خودی کو مستحکم کرنا چاہیئے تاکہ وہ حضور نبی کریمؐ کے قول :-

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا[2]) کے معیار پر پورا اُتر کر حقیقتوں سے معاملہ برآری کے لائق ہو سکے۔

اسرارِ خودی ـ مقدمات

پہلا باب

تمہید

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

نظیری نیشاپوری کا یہ شعر سرنامہ "اسرارِ خودی" ہے۔ نظیری کے بَن میں کوتاہی کا نام ونشاں نہیں۔ اگر وہ کسی درخت کی لکڑی سے منبر نہیں بنا پاتا تو صلیب تراش لیتا ہے۔ یہ دو مصرعے آدمی کی ہمہ گیر صلاحیتوں کی تصویر ہیں اور اس اعتبار سے انہیں اسرارِ خودی کا پیش لفظ ہونا ہی چاہیئے تھا۔

اقبال کی نظم ونثر خودی کے زور پر آدمی کے بااختیار ہونے کا عہد نامہ ہے، اُن کی نظر میں جنّت سے نکالا ہوا انسان وہ راندۂ درگاہ نہیں جس کا نصیب کرۂ ارض پر مجہول اور منفعل زندگی گزارنا ہو، اسی لئے اُن کی چشم تصوّر روحِ ارضی کو آدم کا استقبال کرتے ہوئے یوں ترانہ بہ لب دیکھتی ہے:۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ — ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں — تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے — تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے — محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ[1]

اقبال یہ نظارہ کرتے ہوئے اس احساس سے عاری نہیں ہیں کہ یہ گنبدِ افلاک یہ کوہ، یہ صحرا یہ سمندر اور یہ ہوائیں، کرۂ ارض پر نو وارد اس پیکرِ آب و گِل کے راستے میں ہمیشہ مزاحمت بالائے مزاحمت پیش کرتے رہیں گے۔ اس کے باوجود انہیں یقین ہے کہ غیر خودی کائنات کی طرف سے آدمی کی راہ میں لائی ہوئی ہر

رکاوٹ اس کی قوتِ تسخیر کے لئے ضروری ہی نہیں مبارک ثابت ہوگی۔ کیوں کہ یہی کبھی اس کی صلاحیتوں کے لئے صیقل بنے گی اور کبھی اس کی توانائیوں کے لئے مہمیز اور انہیں رکاوٹوں کے باعث "ممکناتِ قوتِ مردانِ کار" واقعات میں تبدیل ہو سکیں گے[۱]۔ انہوں نے سوچا اور صحیح سوچا کہ آدمی کے ہاتھوں چراغ کی صورت گری کے لئے رات کا اندھیرا[۲] محرک بن کر رہے گا۔

آدمی کی اسی صلاحیت اور خلاقیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے وہ آدم کی رضا کو راکبِ تقدیرِ جہاں کے خطاب کا مستحق سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس درد کا کیا کریں اور اس غم سے کس طرح نجات پائیں جس کے باعث غالب تڑپ کر کہہ اٹھے تھے کہ :۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اقبال بھی آدمی کی اس سبک سری اور بدحالی سے نگاہیں نہیں بچا سکے۔ انہوں نے اسے بڑی شدت سے محسوس کیا اور احساس کی تیز آنچ سے آتش بہ جاں ہو گئے۔ سوزِ دروں نے نغمانِ نیم شبی کے سہارے بے چینی کا علاج کرنا چاہا، لیکن داغ سلگتے رہے، کرب بڑھتا گیا۔ آخر ایک رات پیرِ رومی[۳] کی زیارت نصیب ہوئی۔ پیرِ حق سرشت نے جو کہا مریدِ ہندی کے لئے بہشتِ گوش ہوا۔ اسرار سے پردہ ہٹا اور خودی کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔ یہ باب انہی وارداتِ خیال کا عکاس ہے۔

اقبالؔ نے اپنے فکر و شعور کی پرورش اور تربیت کے لئے مولانا جلال الدین رومیؒ سے جو فیض حاصل کیا ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے اسفارِ خیالی میں وہ پیرِ رومی کے ساتھ کئی نازک مرحلے طے کرتے نظر آتے ہیں۔ اور ادا شناسِ مفاہیم قرآنی، مولانا روم سے اپنے سوالوں کے جواب پا کر مطمئن ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا فلسفۂ سعی و عمل مولانا کے قول "کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی" ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کے جن تصوّرات نے اقبالؔ کے فکر و نظر کی پرورش کی ہے وہ حسبِ ذیل موضوعات سے متعلق ہیں۔

۱۔ کامل یا معیاری انسان

۲۔ عشق

۳۔ حصولِ بقا

۴۔ انائے محدود (آدمی) کا انائے لامحدود (اللہ) سے تعلق۔

اس باب کے آخر میں مثنوی کو اردو کے بجائے فارسی میں لکھنے کی مصلحت بتائی گئی ہے اور قاری سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اسے کلام کی ظاہری خوبیوں پر نظر کرنے کے بجائے مفاہیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

دوسرا باب

اصل نظامِ عالم خودی سے ہے اور تسلسلِ حیاتِ تعیّناتِ وجود کا انحصار استحکامِ خودی پر ہے

اقبالؔ کے تصوّر کے بموجب خودی ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی ہے اور کار فرمائی کے اعتبار سے اس کے دو انداز ہیں۔ ایک قدر آفریں دوسرا مؤثر، انائے قدر آفریں کا مزاج تغیر و تبدّل سے عبارت ہے اور انائے مؤثر کا تقسیم و تفرّق ہے۔ ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ انائے مؤثر کی کارگری ہے لیکن حقائق کی گہری سطح اور خود ہمارے شعور کی اندرونی پرتوں میں انائے قدر آفریں کار فرما ہے۔

کائنات میں ہر وجود ایک معیّن فرد ہے اور ان بے شمار افراد میں ایک ربط، ایک تسلسلِ حیات ہے جس کے باعث وہ پراگندگی کا شکار نہیں ہوتے۔ نظامِ عالم دراصل تسلسلِ حیاتِ تعیّناتِ وجود ہی کا دوسرا نام ہے جس کا انحصار اس قوتِ ناظمہ پر ہے جسے اقبال "خودی" کہتے ہیں۔ یہ کام جو اور کارگر قوتِ تخلیق کی جولانیوں کو برقرار رکھنے کے لئے عجیب عجیب ڈھنگ اور نت نئے روپ لے کر سامنے آتی ہے۔ یہ چونکہ مثبت اور منفی کرداروں سے بہ یک وقت مزیّن اور مسلّح ہوتی ہے، اس لئے اپنے مقاصد کی پیش رفت

کے لیے کبھی تغیر و تبدل کے کرشمے دکھاتی ہے اور کبھی تقسیم و تفریق کے نظارے۔
نیز اسی کے باعث زندگی کا مزاج یہ نظر آتا ہے کہ :۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں ۔۔۔ کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں ۔۔۔ مگر عین محفل میں خلوت نشیں [1]

نیز :

اتر کر جہانِ مکافات میں ۔۔۔ رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج ۔۔۔ اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے ۔۔۔ اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ۔۔۔ ابھرتا ہے مِٹ مِٹ کے نقشِ حیات [2]

نقشِ حیات کا مِٹ مِٹ کے ابھرنا اس وجہ سے ہے کہ خودی زمانے کے دریا میں بہنے کے باوجود دموں کے الٹ پھیر یعنی زمانِ متواتر کی پابند نہیں ہے۔ اس کی کیفیت تو یہ ہے کہ :۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے ۔۔۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے [3]

اور :۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ۔۔۔ ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر [4]

خاکِ آدم میں صورت پذیر ہونے کی منزل تک تعیّنات و جود حسی کشمکشِ تغیّرات سے گزرتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر خودی جلوہ بدست ہونے کے باوجود خلوت پسند نہ ہوتی ، اگر وہ من و تو سے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ من و تو سے پاک نہ ہوتی تو افرادِ کائنات میں وہ ربط،

وہ تسلسلِ حیاتِ تعینات وجود جو نظر آتا ہے مفقود ہوتا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ سرے سے وہ شے ہی نہ ہوتی جسے نظامِ عالم کہا جاتا ہے۔ ہزاروں طرح کی انجمن آفرینیوں میں لگے رہ کر عینِ محفل میں خودی کا خلوت نشین رہنا ہی اس کی وہ ادا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو زندگی میں منقلب کرنے کے بعد بھی از خود رفتہ نہیں ہوتی بلکہ اس طرح خود کو مستحکم کرتی ہے اور اس حالتِ استحکام کو جا پہنچتی ہے جس پر تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود منحصر ہے۔

تیسرا باب

حیاتِ خودی تخلیق و تولیدِ مقاصد سے ہے

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوئے و مگیر
دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است[1]

حیات آگے بڑھتی ہوئی اس حرکت کا نام ہے جو بہت کچھ جذب کر سکتی ہے اور اپنے سفر کے دوران مسلسل آرزوئیں اور معیار پیدا کرتی رہتی ہے[2]۔ لہٰذا فرد کی نشو و نما کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ نت نئے مقاصد اور منصوبے تشکیل پاتے رہیں، کیوں کہ اس سے ہماری فعالیت کی سمت مقرر ہوتی ہے اور نشو و نما

انا کو رنگ ملتا ہے[۱]

اقبال کے تصور کے مطابق خودی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ گوناگوں تجربات سے اپنے آپ کو مستحکم کرے۔ اپنے تحقق اور تکمیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ سفر اور مسلسل سفر کو کسی منزل پر ختم نہیں کرتی۔ نئی نئی منزلوں تک پہنچنے کا شوق اسے بے چین کئے رہتا ہے۔ رہ نوردِ شوق کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا اور کوئی مقام اس کے لئے انتہائے راہ کا حکم نہیں رکھتا گویا[۲] خودی کو یہ احساس ہے کہ:-

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

حقائق کی دنیا خودی کی پہلی منزل ہے لیکن:-

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود   کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود[۳]

ان میں سے ہر جہان آدمی کی یلغار اور اس کی شوخیٔ فکر و کردار کے اظہار کا منتظر ہے۔ لہٰذا شرر میں ستارے اور ستارے میں آفتاب کی تلاش، آدمی کا مقصد ہونا چاہیئے۔

مقصد دور سے نظر آنے والی روشنی ہے جس کی طرف ہم جاتے ہیں۔ یہ منزل ہمارے آگے ہے، اسباب و علل کی دنیا کی طرح ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ ماضی کے جبر کی جگہ اس میں ہم مستقبل کی آزادیوں کا دل کش منظر دیکھ سکتے ہیں۔ میکانکی عالم میں اہمیت ماضی کو ہے لیکن شعور و احساس کی دنیا میں مستقبل زیادہ اہم ہے۔ اسی لئے آدمی معین مقاصد کے ذریعے نئے حقائق کی تخلیق کرتا ہے۔ ممکنات کو واقعات میں تبدیل کرتا ہے اور ضمیرِ وجود سے نئے جہان برآمد

کر لیتا ہے - آدمی کی خودی سعیِ مقاصد میں حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرتی بلکہ اُن کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اُن میں حسب منشاء تغیّر چاہتی ہے۔[۱]

اقبال کے نظریے کے بموجب، مقاصد کی تخلیقی استعداد روحانی حیثیت رکھتی ہے اور یہ استعداد بغیر اس تہذیب نفس کے پیدا نہیں ہو سکتی جو مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے۔[۲] ذہنی زندگی جتنی اعلیٰ ہوگی اسی قدر مقاصد واضح اور معیّن ہوں گے۔[۳]

اقبال نے آدمی کی اخلاقی اور مادّی زندگی کے تضاد کو بڑی حد تک رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلامی روایات کے اس اہم اصول کو واضح کر دیا ہے کہ آدمی کی زندگی میں روحانی اور مادّی عناصر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے جس کے بغیر آدمی کی فطرت درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ جان و تن کے خصائص میں فرق ہے کیونکہ :-

چیست جاں ؟ جذب و سرور و سوز و درد

ذوقِ تسخیرِ سپہر گرد گرد

چیست تن ؟ با رنگ و بو خو کردن است

با مقامِ چار سو خو کردن است[۴]

لیکن تن یا مادہ جو رنگ و بو کا طلب گار اور اطراف و اکناف کا اسیر ہے، جان کے اس جذب و سرور اور سوز و درد کو نقصان نہیں پہنچاتا جو تسخیر ارض و سما کے لئے درکار ہے۔ تن کے تقاضے روحانی مطالبات کا راستہ نہیں روک سکتے۔

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست[۵]

یہ تو آدمی پر منحصر ہے کہ تن کا ہو رہے یا جاں پروری کے لئے تن سے کام لے۔ اگر اس نے اپنا اور اپنے علوم وفنون کا مقصد یہ قرار دے لیا کہ وہ چارسو میں گھر کر رنگ و بو ہی سے سروکار رکھے گا اور حواس سے لذت اندوز ہونے کے علاوہ کچھ نہ کرے گا تو اس کا نصیب زوال ہے۔ وہ زوال پذیر ہو کر اس سطح پر آگرے گا جہاں اس کے مقدر میں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہوں گی۔

تن کا ہو رہنے سے آدمی مجبور اور محصور ہو جاتا ہے لیکن جاں کی بالیدگی اسے آزادیاں بخشتی ہوئی مقاماتِ عالیہ تک پہنچاتی ہے لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ جسم کے سرکش تقاضوں کو روحانی مطالبات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے مقاصد آفرینی کی طرف مائل ہو۔ اگر ایسا ہو سکا تو ان ہی مقاصد کے دامن میں حیات کی اعلیٰ قدریں نظر آئیں گی، انہیں میں تخلیقی استعداد ہوگی اور یہی روشن اور واضح بھی ہوں گے۔

اقبالؔ کے بقول ان بلند، روشن اور دل پذیر مقاصد کا حصول آرزو کے بغیر ممکن نہیں۔ آرزو ہی وہ سرمایۂ حیات ہے جس کے نہ ہونے سے زندگی، موت بن جاتی ہے۔

زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد　　　شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد[۱]

چوتھا باب

خودی عشق و محبّت سے مستحکم ہوتی ہے

مقاصد کی لگن کے لئے اقبال نے "عشق" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا ولولہ انسان کی فطرت میں اُبلا پڑتا ہے اور جس کے بغیر اس کا معنوی ارتقا ادھورا رہتا ہے[۱]۔ اقبال اور مولانا روم عشق کو زندگی کی بڑی ہی عظیم قوت سمجھتے ہیں جس کی حقیقت کے اظہار سے زبان معذور رہے پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق کسی بار کو گراں نہیں سمجھتا اور کسی تکلیف کو نظر میں نہیں لاتا۔ یہ اپنی سکت سے زیادہ کے حصول کی کوشش کر بیٹھتا ہے اور کسی بھی کام کو ناممکن کہہ کر گریز کے لئے حیلوں کی آڑ نہیں پکڑتا کیونکہ یہ اپنے لئے سب کچھ روا اور ہر کام ممکن جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کر گزرنے کا اہل ہے لہٰذا ان مرحلوں کو بھی طے کر کے کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچ جاتا ہے جہاں عشق و محبت سے عاری وجود چکرا کر گر پڑتے ہیں[۲]۔ یہ سب صحیح ہے لیکن اقبال اس اصطلاح کو اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ:-

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰؐ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہِ حرم - عشق امیر جنود　　عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات [1]

اقبال کی نظر میں عشق اور خواہشِ جذب و تسخیر ہم معنی ہیں اور اس کی بلند ترین شکل، قدروں اور معیاروں کی تخلیق نیز اُن کے حصول کی کوشش ہے [2] اس اعتبار سے عشق کی ادائیں بھی انوکھی ہوتی ہیں مثلاً :-

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق　　کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش　　کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق

اور :-

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق　　کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر　　کبھی مولا علی خیبر شکن عشق [3]

اقبال اور رومی دونوں کے تصور کے بموجب عشق کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ عاشق کے دل میں معشوق کی صفات جذب کر لینے کی شدید خواہش ہو [4] اس سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور فرد کی صلاحیتوں میں ارتکاز اور اُن کی شدت میں اٹھان پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اسی وجہ سے ہمیں بڑی بڑی شخصیتوں کے تذکرے میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اپنی خودی کو منشائے الٰہی کے مطابق بنا لیا تھا یہی سبب ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں اور شہیدوں نے اطاعتِ الٰہی کی راہ میں عام آدمی کی سطح سے بلند ہو کر حیرت انگیز معجزے دکھائے ہیں [5] مثلاً :-

عشق با نانِ جویں خیبر گشاد　　عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد [6]

انسان کے بقول منشائے الٰہی کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے ضروری ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی ہدایت "تخلقوا باخلاق اللہ" (اپنے میں اللہ کے اخلاق و صفتیں پیدا کرو) پر عمل کیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں۔ اگر ہے تو بس اس طرح کہ کسی ایسی ذات سے عشق ہو جائے جس کے افکار و اعمال منشائے الٰہی سے ہم آہنگ ہوں، ایسی ذات پیغمبرؐ اسلام کی ہے لہٰذا اقبال اُن سے والہانہ عشق کا مشورہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اُن کے اسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنائے بغیر اُن کی ذات سے عشق ممکن نہیں۔ اُن کے بقول عشق اتباعِ سنّتِ نبوی ہی کا ایک نام ہے اور اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

اس باب میں تقلید کے معیار کو ظاہر کرنے کے لئے حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے صرف اس لئے اجتناب کیا تھا کہ وہ اس پھل کو حضور نبی کریمؐ کے طریقہ سے نہیں کھا سکتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ نے یہ پھل کس طرح نوش کیا تھا۔

اتباعِ سنّتِ نبوی کے علاوہ، اقبال کسی کی پیروی پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے علاوہ ہر تقلید کو شخصیت کے لئے مضر سمجھتے ہوئے ہدایت کرتے ہیں کہ :-

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

پانچواں باب

خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے

سوال یا گدائی اُن برائیوں میں سے ایک ہے جو خودی کو کمزور کرتی ہیں۔ خودی کا تقاضا تو یہ ہے کہ فرد اپنی صلاحیتوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں جدوجہد کے ذریعہ بروئے کار بھی لائے، لیکن سوال کا عادی ہو کر آدمی خود پر اعتماد نہیں کر پاتا اور دوسروں کا دستِ نگر ہو کر عمل کی دنیا سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں اسی کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

سوال کا مزاج پہچاننے کے لئے قرآن مجید سے واضح اشارے ملتے ہیں۔ چنانچہ ان حاجتمندوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ڈھٹائی سے دستِ سوال دراز نہیں کرتے، ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"تو اُن کے چہرے سے پہچانتا ہے وہ لوگ لپٹ کر نہیں مانگتے"۔[1]

قرآن مجید میں ایک اور جگہ بھی لفظ "سوال" کا استعمال فکر انگیز ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے یہ معاملہ تھا کہ مدعی کے بقول اس کے پاس صرف ایک دنبی تھی جسے فریقِ مخالف اپنی تند بیانی کے زور پر حاصل کرنا چاہتا تھا حالانکہ اُس کے پاس ننانوے دنبیاں تھیں لہذا :-

(حضرت داؤد نے) کہا۔" اس نے اپنی دنبیوں کی طرف تیری دُنبی مانگ کر ظلم کیا۔" [1]

ان ارشادات کی روشنی میں سوال وہ طلب ہے :-

۱۔ جو آدمی سے غیرت چھین لے۔

۲۔ جس کے باعث آدمی ناروا طریقوں سے فائدہ اٹھانا چاہے' اور

۳۔ جو آدمی کی تخلیقی پر ورقوتوں کے ضعف و زوال کا باعث ہو

مختصراً یوں کہا جائے کہ مفید معاشرہ محنت کے بغیر جو کچھ بھی حاصل کیا جاتا ہے وہ بھیک ہے [2]

لہٰذا اقبال کی نظر میں رعایا سے خراج وصول کر کے عیش کرنے والا بادشاہ زرتار کپڑوں میں لپٹا ہوا بھک منگا ہے۔ اُن کے بقول :-

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زرّیں قبا

اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹّی ہے اس کی کیمیا

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا [3]

سوال کی لعنت سے بچانے والی صفت خودداری ہے جس کے معیار کے بطور حضرت عمر فاروق رضؓ کے کردار کو پیش کیا گیا ہے اور اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک سفر کے دوران آپ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تھا جسے اٹھانے کے لئے آپ بہ نفسِ نفیس اونٹ سے نیچے اترے اور اپنے کام کے لئے بھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔

چھٹا باب

جب خودی عشق و محبت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی تمام ظاہر و پنہاں قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

چوتھے باب اور اس باب کا موضوع ایک ہی ہے۔ ان اوراق میں مزید تشریح و توضیح کے لئے حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے جلال کا واقعہ قلم بند کیا گیا ہے۔

حضرت قلندر صاحب کا نام شیخ شرف الدین ہے۔ سال ولادت ۶۰۲ھ اور سنہ وفات ۷۲۴ھ ہے، مزار مبارک پانی پت میں ہے۔ آپ کی زندگی میں دہلی، خاندانِ غلاماں خلجیوں اور تغلقوں کا دار السلطنت رہا۔ آپ ان تمام علوم و فنون سے اچھی طرح واقف تھے جو اس وقت ایک فاضل کے لئے ضروری سمجھے جاتے تھے۔

چالیس برس کی عمر میں پانی پت سے دہلی تشریف لانے کے بعد آپ نے مسجد قوت الاسلام کو درس و تدریس کا مرکز بنایا اور پھر چالیس سال تک یہی آپ کا معمول رہا اس کے بعد "بہ رضامندی جمیع درویشاں و دانش منداں" حکومت نے پایۂ تخت کا منصب قضا دہلی آپ کے سپرد کر دیا اور بیس سال

تک مسندِ افتاء آپ کے نفوسِ قدسیہ سے آراستہ رہی ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ قلندر صاحب پر جذبۂ شوق کا غلبہ ہوا اور آپ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک رات دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا اور علمی کتابیں تھیں دریا میں ڈال دیں۔ پانی پت پہنچے تو ڈیڑھ ہزار آدمی ساتھ تھے۔ سب کو رخصت کرکے اسی علاقے میں ٹھہر گئے۔ اب نہ پیری تھی نہ مریدی جو کچھ تھا زہد و عبادت اور قلندری گویا یہ عالم تھا کہ:۔

عشق اوّل، عشق آخر، عشقِ کُل
عشق شاخ و عشق نخل و عشق گُل

اور شانِ قلندری کی یہ کیفیت کہ "پانچ چھ بادشاہ اور تاجدار اس فقیر کی چوکھٹ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کرتے تھے۔"

بموجب ارشادِ حضور سرورِ کائنات، حضرت قلندر صاحبؒ ترک و استغنا کے مقامِ بلند پر پہنچ لیے تھے چنانچہ اپنے اشعار میں حدیثِ نبی کریم "خیر الغنا غنا القلبؐ" کی تفسیر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

زہد و تقویٰ چیست اے مردِ فقیر — لا طمع بودن ز سلطان و امیر
گر بدست آید ترا گنجِ نقود — ورنہ داری ہمتِ عالی چہ سود

حضرت قلندر صاحب کے بقول "مجھے فیضِ روحانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہنچا ہے جس طرح سورج کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہو جاتی ہے۔"

آپ کی منظوم تصانیف میں ایک دیوان۔ مثنوی بو علی قلندر شاہ قلندر۔ غزلیات و مثنویات کا ایک مجموعہ اور نثر میں حکم نامہ اور ایک مکتوب مشہور ہیں۔

اس باب میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ غالباً علاؤ الدین خلجی کے زمانے

کا ہے۔ اس بادشاہ کا دورِ حکومت ۶۹۵ھ / ۱۲۹۰ء سے ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء تک رہا ہے اور بحالتِ قلندری حضرت بوعلی شاہ کی دہلی سے پانی پت کو واپسی ۷۰۰ھ کے آس پاس معلوم ہوتی ہے۔ پھر ایک واقعہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ علاؤالدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ کو قلندر صاحبؒ کی خدمت میں کچھ ہدیے دیکر ضرور بھیجا تھا اور جب انہوں نے قلندر صاحبؒ سے درخواست کی کہ بادشاہ کو کچھ تحریر فرمادیں تو انہوں نے کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر دے دیا تھا کہ :-

"علاؤالدین خلجی خوطۂ دہلی مقرر دارند کہ بہ بندگانِ خدا زندگانی نیکو کند۔"

(علاؤالدین خلجی کو خوطۂ دہلی مقرر رکھتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے۔

اس باب کے اشعار سے جہاں عشق و محبت کے بے پناہ جلالی اثرات کا پتا ملتا ہے وہیں ترک و استغنا کے اسلامی تصوّر اور رہبانیت پسندوں کے تصوّرِ ترکِ دنیا کا فرق بھی سامنے آجاتا ہے۔

ساتواں باب

حکایت

اس معنی میں کہ مسئلۂ نفیِ خودی مغلوب قوموں کی اختراع ہے جو اس مخفی طریقے سے غالب قوموں کے اخلاق کو کمزور بنا دیتی ہیں

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب
کھول کر کہیئے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

اس حکایت کے دلچسپ پیرائے میں اقبال نے نفیِ خودی یعنی رہبانیت یا ترکِ دنیا کے مسئلے کو واضح کیا ہے۔ ایک دو نہیں عرصۂ تاریخ میں ایسے کئی مقام ملتے ہیں جہاں آدمی نے یہ سوچنا پسند کیا ہے کہ :-

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

(مرزا صائب)

اس فرق کو دیکھ کر ہر سکون کے بقدر ہی راحت ملتی ہے۔ دوڑتے سے زیادہ چلنے میں۔ چلنے سے زیادہ کھڑے رہنے میں۔ اس سے زیادہ بیٹھنے میں بیٹھنے سے زیادہ سوتے میں اور اُس سے بھی زیادہ مرجانے میں)

اقبال کی باریک بیں نظر سے دیکھا جائے تو اس افتادِ طبع کا سانچا مغلوب قوموں کا مخصوص ذہن ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح میں جب یونانی بھم جبر، رومۃ الکبریٰ سے مغلوب ہوئے تو زندہ دلانِ یونان کی زندہ دلی، غیر قوم کا محکوم بن جانے کے بعد مُردہ دلی میں تبدیل ہوگئی اور اس سیاسی مُردہ دلی کا اثر فلسفۂ یونان پر یہ ہوا کہ برٹرینڈ رسل کے بقول "ارسطو کے بعد کا ہر فلسفی دنیا سے متنفر نظر آنے لگا"۔

یہودیوں پر یہ مصیبت اس طرح آئی کہ فتوحات کی رَو میں جب روم والوں نے اُن کی بے بس آبادیوں کو غلام بنانے کے لئے پے در پے حملے کرنا شروع کئے اور نوبت بایں جا رسید کہ حضرت عیسیٰؑ کے ایامِ شباب میں "ناصرہ" کے آس پاس اکثر قصبے روم والوں کے غلام بن کر بک گئے تو بحیرۂ روم کی بڑی بڑی بندرگاہوں میں ایک خاص عقیدے کی داغ بیل پڑنے لگی اور مغلوب یہودیوں نے وہ دستور بود و باش پسند کرلیا جو اُن کے حوصلہ مند آقاؤں کی طرزِ زندگی سے بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے اپنی غلامی، کمزوری، بدنصیبی اور غربت کو مظہرِ خیر سمجھنا شروع کردیا۔ اب انہیں اپنی سلامتی اس میں نظر آنے لگی کہ خودی کی نفی کردی جائے۔ یہ ایک دفاعی تدبیر تھی جسے یہودی اپنے اجتماعی وجود کی بقا کے لئے اپنانے پر مجبور تھے۔

آئینۂ تاریخ میں کئی غلام قومیں اس تدبیر کا سہارا لئے نظر آتی ہیں لیکن یہ دفاعی تدبیر ہی نہیں ہے، اقبال کے بقول اس کا ایک جارحانہ رُخ بھی ہے یعنی وہ مخفی اثر جس کے ذریعے مغلوب قومیں حکمراں قوموں کے اخلاق کو کمزور بنا کر اُن پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ فتنہ اس طرح اُبھرا کہ پہلی ہی صدی ہجری میں جب دمشق مرکزِ حکومت بنا تو مسلمانوں میں عربی اور عجمی کے امتیازات بڑی شدت سے نمودار ہونے لگے۔ ابن حزم الاندلسی کے بقول اہلِ فارس، وسعتِ سلطنت اور تمام اقوامِ عالم پر بالادست ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت ہی بزرگ و برتر سمجھتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے احرار اور بقیہ لوگوں کے لئے غلام کا لقب وضع کر لیا تھا[۱] لیکن جب وہ ریگستانِ عرب کے شتربانوں سے مغلوب ہوئے تو اول اول انہیں اپنی ذلت کا شدید احساس ہوا مگر اسلام کے اصولِ مساوات و انصاف اور صحابہ و تابعین اور علماء و فقہا کے دین دار طرزِ عمل نے نہ صرف یہ کہ ان کے اس زخم پر مرہم رکھ دیا بلکہ انہیں عالم گیر اُمتِ مسلمہ کے اندر کامل معاشرتی مساوات کے ساتھ جذب کرنا شروع کر دیا۔ اب اگر اس کی پُشت پر حکومت کی انتظامی پالیسی بھی انہیں اصولوں کے مطابق ہوتی تو کبھی کسی غیر عرب قوم کے اندر اپنی علیحدگی اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا[۲]

لیکن ہوا یہ کہ عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نومسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود ہو گیا پھر یہ خرابی اور آگے بڑھی، والی۔ قاضی حتیٰ کہ امامِ نماز مقرر کرتے وقت بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔ اِس لئے

عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل انہیں عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی عربوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔[۱]

بنی امیہ کا دورِ حکومت سو سال بھی نہ چل پایا تھا کہ ختم ہو گیا اور زمامِ اقتدار بنی عباس کے ہاتھ آئی۔ "لیکن وہ نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں جو بنی امیہ نے بھڑکائی تھیں بنی عباس کے عہد میں پہلے سے بھی شدید تر ہو گئیں ..... اور بنی امیہ کے دور میں ان کے عربی تعصب کی وجہ سے عجمی قوم پرستی (شعوبیت) کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی بنی عباس کے زمانے میں وہ پوری قوت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔[۲]

ابن حزم کے بقول "انہوں نے بصورتِ جنگ مختلف اوقات میں اسلام کو فریب دینا چاہا۔[۳] اور یہی نہیں کہ صرف عربی عصبیت کے خلاف مورچہ لگایا بلکہ خود اسلام کے خلاف بھی "زندقے" کا ایک محاذ اٹھا کھڑا کیا۔[۴] یہ فرقہ جسم کو ذلیل اور مادی چیزوں کو حقیر سمجھنے کی تعلیم دیتا تھا اور منصور عباسی کے عہد (۱۳۶ھ - ۷۵۴ء ۱۵۸ھ - ۷۷۵ء) میں پوری طرح سر اٹھا چکا تھا۔ اس کے اخلاقی دستور کی نمایاں خصوصیت دنیا میں زہد اور آخرت کے لئے عمل کی تعلیم تھی۔[۵] یہ لوگ کہتے تھے کہ گوشت حرام ہے۔ پانی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے اور کسی قسم کے جانور کو ہلاک نہیں کرنا چاہیئے۔[۱]

اس طرح عرب غلبے کے مقابل رہبانیت کے نام پہ ایک دفاعی تدبیر اپنانے کے ساتھ ساتھ مغلوب عجمیوں نے اس تعلیم و تلقین کے ذریعہ مسلمانوں کو صرف اعتقادی اور اخلاقی فساد کے خطرے ہی سے دوچار نہیں کیا بلکہ سیاسی و اجتماعی حیثیت سے بھی یہ فتنہ مسلم معاشرے اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے والا تھا۔[۲]

مغلوب قوموں کی یہی اُفتادِ طبع اس باب کا موضوع ہے۔

آٹھواں باب

افلاطونِ یونانی جس کے تصورات سے تصوّف اور ادبیاتِ اسلامیہ بہت متاثر ہوئے مسلکِ گوسفندی پر عامل تھا، اس کے تخیلات سے دُور رہنا واجب ہے

کائنات کی حقیقت کے بارے میں تین نظریئے سامنے آتے ہیں (۱) یہ کہ کائنات اپنے وجود کے لئے کسی کی محتاج نہیں اور اشیائے کائنات کا وجود، حقیقی اور بذاتِ خود قائم ہے۔ اس نظریئے کو ماننے والے مادّیئین یا مادہ پرست کہے جاتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ اشیائے کائنات کسی نہ کسی حقیقی نمونے کی نقل ہیں۔ حقیقی اشیا کی ہر نوع کا ایک نمونہ (عین) ہے جو عالمِ مثال میں موجود ہے اور خارجی طور پر کائنات میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے فریبِ نظر ہے۔ یہ نظریہ عینیئین یا تصور پرستوں کا ہے[۱]

۳۔ اور یہ کہ کائنات کا وجود تو حقیقی نہیں، ظلّی ہی ہے یعنی وجودِ کائنات کسی حقیقی وجود کا ظلّ (سایہ) ہے لیکن یہ سایہ فریبِ نظر نہیں ہے بلکہ خارجی طور پر موجود ہے۔ اسے معروضی تصوریت کہا جاتا ہے۔

افلاطون، تصور پرستوں (عینیین) کا سردار اور اقبال معروضی تصوریت کے نمائندے ہیں۔

سقراط کا شاگرد افلاطون (تقریباً ۴۲۷ ق م تا ۳۴۷ ق م) ایتھنز میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے خیال کے بموجب مادہ "کچھ نہیں" ہے۔ خارجی دنیا، ادراک کے اعتبار سے نفس کی اور ساخت و کارکردگی کے اعتبار سے اعیان کی ذیلی ہے۔ لہٰذا کائنات کو اس نمونۂ کامل کی نقل بدرجہ اوسط سمجھنا چاہیئے جو کسی مائل بہ تخلیق روح کے تصور میں ہے۔[۱] "اعیان" ان اشیائے عظیم تر حقیقتیں ہیں جن کا علم حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔[۲] مثلاً عینِ انسان کسی بھی انسان سے زیادہ حقیقی ہے۔

افلاطون کے بقول 'اعیان' آفاقی جواہر ہیں یعنی وہ مطلق اور بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر سب ہی اشیاء کا دار و مدار ہے، لیکن وہ خود کسی پر منحصر نہیں۔ اپنی نوع کے اعتبار سے ہر عین مستقل اور مطلقاً مکمّل واحدہ ہے اور اس کا کمال ہی اس کی حقیقت ہے۔

اعیان، سالم و ثابت اور لافانی ہوتے ہیں، لیکن مشاہدے میں نہیں آسکتے اسی لئے یہ مسئلہ، مسئلۂ اعیانِ نامشہود کہا جاتا ہے۔ افلاطون کے بقول چونکہ حواس کی دنیا، مشاہدۂ حسی کا اور "عین" ادراک و تعقل کا معروض ہے۔ اس لئے "عین" اور محسوس کی جانے والی شے کی صفات کچھ متضاد اور کچھ مختلف ہوتی ہیں....

مثلاً:-

عین حقیقی ہے اور محسوس کی جانے والی شے نیم حقیقی

عین کلّی اور آفاقی ہے اور محسوس کی جانے والی شے مخصوص اور انفرادی

عین واحد ہے اور محسوس کی جانے والی شے بہ کثرت
عین ماورائے زمان و مکاں ہے اور محسوس کی جانے والی شے زمانی اور مکانی
عین دائمی اور ناقابلِ تغیر ہے اور محسوس کی جانے والی شے قابلِ تغیر۔

مزید برآں یہ کہ حواس کی دنیا چونکہ ہر لحظہ متغیر ہوتی رہتی ہے، اس لئے اس کا علم ممکن نہیں۔ لہٰذا اس دنیا میں ہم جسے علم کہتے ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہے۔ علم اگر ممکن ہے تو ناقابلِ تغیر اعیان ہی کا ہے۔

نوافلاطونیت[۵]: افلاطون کے بعد یونان میں سکندرِ اعظم کے استاد ارسطو کا دور آیا اور پھر وہ دور شروع ہوا جسے وسطی افلاطونی فلسفے کا دور کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے بقول جس کی خصوصیت یہ تھی کہ ارسطو کے بعد کا ہر فلسفی تارک الدنیا ہو گیا[۶] وسطی افلاطونی فلسفہ، انتخابی فلسفہ تھا جو رواقی اور افلاطونی فلسفے کے ساتھ ساتھ ارسطو اور فیثاغورث کے فلسفے سے بھی بہرہ مند ہوا۔ اس انتخابی فلسفے کی ایک شاخ نوافلاطونیت (افلاطونیتِ جدیدہ یا اشراق) ہے جس کا مرتب کرنے والا افلاطنس[۵] تھا۔

پلاٹینوس یا افلاطنس، افلاطون کے فلسفے کا دل دادہ تھا، لیکن اسے افلاطون کا حلقہ بگوش نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا انداز تو یہ نظر آتا ہے کہ افلاطون کا مقلد بھی تھا اور قلادہِ تقلید اتار کر آزادانہ طور سے غور کرنے کا حامی بھی۔ پھر یہ بھی قرین از قیاس ہے کہ وہ افلاطون سے کہیں زیادہ اپنے استاد "امونی یوس ساکاس" سے متاثر ہوا ہو گا جو عیسائی مذہب ترک کر کے وسطی افلاطونی فلاسفہ کے حلقے میں داخل ہو گیا تھا[۷]

نوافلاطونیت میں جسم و جسمانیت کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا جواب حاصل

کرنے سے پہلے فلاطینس کے نظریات کی تشکیل کے پس منظر کو دیکھنا چاہئے جس کا ایک رُخ تو اس کی تربیتِ فکر اور دوسرا رُخ اس کی کمزور صحت نیز پراگندگی کا شکار وہ معاشرہ تھا جس میں اس نے دن گزارے۔ فلاطینس کی صحت بے انتہا خراب تھی۔ وہ ضعفِ بصارت کے ساتھ ساتھ جذام میں بھی مبتلا تھا۔ نیز وہ زمانہ جس میں اُس نے عمر بسر کی، دورِ طوائف الملوکی تھا اس کی پیدائش سے کچھ پہلے رومۃ الکبریٰ کی فوج بادشاہ گر بن چکی تھی اور جسے چاہتی تھی انعام دے کر بادشاہ بنا دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں فلسفی فلاطینس جسم و جسمانیت کی یہی تعلیم دے سکتا تھا کہ جو لوگ دنیا میں پھنسے ہوئے ہیں وہ تو جسم کی توانائی اور خوب صورتی کو بھی حاصلِ زیست سمجھتے ہیں اور دولت و حکومت کو بھی لیکن جو لوگ نیک ہیں اور انہیں یہ چاروں باتیں حاصل ہیں تو وہ ان کو اتنا بے کار سمجھتے ہیں کہ ان کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں نیکوکار انسان اپنی تندرستی کی طرف سے غافل تو نہیں ہوتا مگر اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ " وہ کبھی کبھی بیمار پڑے ..... تاکہ اُسے جسم سے ضرورت سے زیادہ محبت نہ ہو۔"

فلاطینس کے بقول روح کی نجات کے لئے امر لابدی ہے کہ وہ اس رجس سے پاک ہو جائے جو اُسے مادّی خواہشات اور خیالات سے حاصل ہوئی تھی۔ اس نجاست سے طہارت اسی طرح ممکن ہے کہ روح عقلِ اوّل کی ہو کر رہ جائے اور مادّی خواہشات و خیالات سے کوئی سروکار نہ رکھے [۱]

طالب صفوی کے بقول فلاطینس کا یہ معجون مرکب فلسفہ ایک ایسا مائدہ

لذّتِ درد ہے۔ جس سے مشرق و مغرب کے ان تمام طریقوں کا کام لبقدر لب و دنداں نکلا جو تیسری صدی عیسوی کے بعد معرض وجود میں آئے اور جن کا دارومدار حقیقۃً فلسفے پر نہیں بلکہ وجدان پر ہے لہ اس سے صوفیائے کرام کے اصحابِ صحو کا کام بھی نکلا ہے اور اصحابِ سکرہ کا بھی ۲ہ اس قول کی روشنی میں حقیقت کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ رہبانیت پسندوں پر افلاطون کے تصوّرات کی جو چھاپ نظر آتی ہے وہ دراصل نو افلاطونیت کے سانچے کی ڈھلی ہوئی ہے۔

اس باب میں لفظ "تصوّف" کا استعمال بھی وضاحت طلب ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اقبالؔ تصوّف کو بھی مسلکِ گوسفندی اور طریق از کار رفتگاں سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ اقبالؔ کی نظم و نثر اور زیرِ نظر مثنوی ہی میں ایسی کئی مثالیں نظر آتی ہیں جو حقیقی تصوّف اور سچے صوفی کے مقام کی رفعت ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سچے مسلمان صوفی وہ بزرگانِ دین تھے جنہوں نے نو افلاطونیت کے بخلاف رہبانیت یا ترکِ دنیا سے اجتناب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ نگاہیں ان کی شانِ فقر اور رہبانیت کا فرق دیکھنے سے قاصر رہی ہوں" یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے نہاں خانۂ دل میں اللہ کی محبّت کے بعد اگر کسی کی محبّت تھی تو وہ اس کے رسول اور نبی تھے۔ اُن کو اپنے رسول اور نبی کا بتایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ عاشق اپنے معشوق اور محبوب کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے (تخلّقوا باخلاق اللہ) اس کو اپنے محبوب کی خصلتوں سے بھی ایسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا اپنے محبوب سے ۳ہ خود ہادیٔ برحق

حضور نبی کریمؐ ہدایت کرنے سے پہلے اللہ کی خصلتیں اپنے اندر پیدا کر چکے تھے۔ لہٰذا ان بزرگانِ دین کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ حضور نبی کریمؐ کی تقلید کریں اور اتباعِ سنتِ نبوی کا معیاری نمونہ بن کر دکھائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ حضورؐ کی سنتِ مبارکہ کیا ہے؟ تو اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ترکِ دنیا یا رہبانیت حضورؐ کی سنت یقیناً نہیں ہے۔

اقبال رسمی تصوف سے اسی لئے بیزار ہیں کہ وہ زندگی سے گریز سکھاتا ہے۔ وہ افلاطونی اعیانِ ناشہود اور اس متصوفانہ فلسفۂ حیات کو جو اس پر مبنی ہے غیر اسلامی اور وہم پرستی قرار دیتے ہیں نیز یونانی تصوروں اور ان کے اجتماعی متعلقات کو جامد اور سکونی خیال کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عقل انسانی کیلئے چاہے کتنے ہی قابلِ قبول کیوں نہ ہوں لیکن بے حد تجریدی ہونے کے باعث جماعت کے تخلیقی قویٰ کو متحرک نہیں کر سکتے۔ [1]

اقبال معروضی تصوریت کے نمائندے ہیں جس کی رُو سے ذہن اور فطرت یا مادے اور روح کا تناقص دُور ہو جاتا ہے۔ خارجی اور اندرونی حقیقت ایک دوسرے میں سموئی ہوئی رہتی ہے اور ان میں ایک قسم کا عملی تعلق ہوتا ہے جو ہر حالت میں قائم رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو افلاطونی اور نوِ افلاطونی نظامِ فکر کے خلاف اقبال نے اپنی تصوریت کو حقائق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا ہے اور صورِ علمیہ یا عالمِ اعیان سے زیادہ عالمِ امکان کے حقائق و اسرار معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی باعث وہ ان اصولوں سے اختلاف کرتے ہیں جو زندگی کے حقائق سے گریز سکھاتے ہیں اور حرکت و عمل کے بجائے سکون و

جمود کی طرف راغب کرتے ہیں۔ وہ اس رہبانی نقطۂ نظر کے خلاف ہیں جو انسانی خواہشوں کو روحانی ترقی کا دشمن خیال کرتا ہے۔ خواہشوں کی تہہ میں جو زبردست قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان کو مٹانے کے بجائے ان میں روحانی ضبط سے ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے اور انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف کیا جاسکتا ہے۔ خواہش اور ارادے کا ضبط بڑی نیکی ہے اور اخلاق اسی سے عبارت ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک کرامت کے افسانہ و افسوں سے زیادہ اہم ممکناتِ حیات کا اظہار ہے جو سعی و عمل اور عرفانِ ذات پر منحصر ہے اُن کے بقول:

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

ایک اور جگہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر ذکرِ نیم شبی اور مراقبوں سے خودی کی نگہبانی نہ ہوتی ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تصوف کے خیالات جو شاعری کے ذریعہ اسلامی ملکوں میں پھیلے اُن میں دنیا زندگی سے گریز کی تعلیم تھی جو تنزل اور انحطاط کے زمانے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تاتاری حملے کے بعد اسلامی ملکوں میں جو عام مایوسی اور زندگی سے بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس کی نسبت اقبالؔ نے لکھا ہے کہ:

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و

توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک توانائی حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین...... (اقبال نامہ صـ ۴۴-۴۵)

اقبالؔ اس قسم کے تصوف اور اس پر مبنی شعر وادب کے خلاف ہیں۔ وہ اس صحیح اسلامی تصوف کے خلاف نہیں ہیں جو حرکت اور تغیر کے اصول سے قوت حاصل کرتا ہے اور جس میں بے عملی کے جمود کے بجائے عمل کی وہ خالص اور پاکیزہ ترین صورت ملتی ہے جو قرآنی تعلیم پر مبنی ہے۔ لہ

نواں باب

حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہُنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ لہ

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اُس کے شعرا اور آرٹسٹ کی الہامی

صلاحیت بہم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز نہیں کہ جس پر کسی کو قابو حاصل ہو۔ یہ ایک عطیہ ہے جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک وہ اسے حاصل نہ کر چکا ہو۔ اس عطیے سے فیض یاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک۔ اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دلوں کو لُبھا سکے، قوم کے لیے اٹیلا یا چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کُن ثابت ہو سکتی ہے۔[۱]

رسولِ کریمؐ نے امرا القیس کے متعلق جو قبل اسلام کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے فرمایا تھا:

اشعر الشعرا و قایدہم فی النار یعنی وہ شاعروں کا سردار ہے۔ لیکن جہنم کی راہ پر وہی ان کا رہبر ہوگا۔"

مرئی کو اس کا موقع دینا کہ وہ غیر مرئی کی تشکیل کرے اور فطرت کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جسے سائنس کی زبان میں مطابقت یا توافق کہتے ہیں۔ دراصل یہ تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ فطرت نے روحِ انسانی پر غلبہ پا لیا۔ انسانی فطرت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے تہیجات کے خلاف مقاومت اختیار کی جائے نہ کہ اُن کے عمل کے سامنے اپنے آپ کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ موجود ہے اس کی مقاومت اس واسطے کرنی چاہیئے کہ جو موجود نہیں ہے اس کی تخلیق ہو۔ ایسا کرنا صحت و زندگی سے عبارت ہے۔ جو آرٹسٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے

وہ انسانیت کے لیے باعثِ برکت ہے"۔ ؎۱

"آرٹسٹ کی بدولت فطرت کے مہمل طومار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ آرٹسٹ کی زندگی دو دنیاؤں میں بسر ہوتی ہے ایک اُس کے تخیل کی دنیا اور ایک خارجی عالم فطرت۔ اصلی آرٹسٹ خارجی عالم کی چمک دار سطح کی نقالی کو اپنے لیے ننگ سمجھتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ اس کی پُراسرار روح کو جذب کرنا چاہتا ہے۔ فطرت نقل کے لئے نہیں بلکہ توجیہہ کے لئے ہے۔ کائنات اظہار و توجیہہ کی منتظر ہے اور شاعر اس کام کو انجام دیتا ہے"۔ ہر بڑے شاعر کے کلام کی تہہ میں آرٹ کا ایک مخصوص تصور کارفرما ہوتا ہے جو بڑی حد تک اس کے کائنات کے تصور کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک آرٹ خودی کے اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ وہ آرٹ جس میں خودی باقی نہیں رہتی کوئی مستحسن چیز نہیں۔ "آرٹسٹ اپنے آرٹ کے ذریعے زندگی کے اظہار کا آرزو مند ہوتا ہے"۔ آرٹ زندگی سے علیحدہ کوئی قدر کی چیز نہیں اس لئے آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کا دور سے تماشا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی دوڑ دھوپ میں خود بھی شریک ہو۔ جو آرٹسٹ زندگی سے دور ہے اس کی تخلیق لازمی طور پر مصنوعی بے جان اور غیر حقیقی ہوگی ؎۲

اس باب میں اقبال نے شاعر کے سینے کو تجلی زارِ حسن کہا ہے۔ ان کے بقول شاعر کی نگاہ سے خوب، خوب تر بنتا ہے، اس کے آب و گِل میں بحر و بر اور اس کے دل میں سینکڑوں جہانِ تازہ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ البتہ زوال پذیر قوموں کے شاعر ذوقِ حیات سے عاری ہونے کے باعث اپنے فن و ادب کی

انہیں سے قوم کے اعصاب کو مفلوج کر دیتے ہیں اور اُن کی جادوگری سے قومیں موت کو زندگی سمجھ لیتی ہیں۔ اقبالؔ ہر فن کار اور بالخصوص مسلمان فنکاروں کو ہدایت کرتے ہیں کہ انہیں اپنی گرہ کے نقدِ سخن کو زندگی کی کسوٹی پر جانچنا چاہیے اور اس کی پرکھ کے لئے خودی کو معیار بنانا چاہیئے تاکہ ادب میں فکرِ صالح نمودار ہو۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے وہ ملّت کے فن کاروں کو چمن زارِ عجم سے نکل کر ریگ زارِ عرب میں جانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ وہاں زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک ہو کر وہ اصلی۔ جان دار اور نیک ادب کی تخلیق کر سکیں۔

دسواں باب

تربیتِ خودی کے تین مرحلے ہیں۔ پہلے کا نام اطاعت دوسرے کا ضبطِ نفس اور تیسرے مرحلے کا نام نیابتِ الٰہی ہے

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیبؑ و شبانیٔ شب و روز

قرآن مجید کے الفاظ میں آزاد شخصیت کے عطیئے کو امانت کہا گیا ہے۔

جو آسمانوں زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا گیا تھا لیکن وہ اس کے وقر و جلالت کے متحمل نہ ہو سکے البتہ انسان کے حوصلے نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور تبھی اُسے وہ سنگین اور صبر آزما خدشات و مصائب قبول کرنا پڑے جو اس امانت سے متعلق ہونے کے باعث المیۂ حیات کو گہرا کر دیتے ہیں مگر انہیں کے روبرو یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ انسان کی قوت کے ممکنات، آزمائش کی راہ پر لگ کر نشو و نما پا سکیں۔ اس طرح حیات" انسان کو جملہ مخلوقات میں بلند ترین درجہ دیتی ہے یعنی اُسے زمین پر اللہ کا خلیفہ بنا دیتی ہے۔[1]

دنیا کے سب ہی بڑے بڑے مفکروں کی طرح اقبال کا خیال بھی یہی ہے کہ فرد کی قوت کے ممکنات آزادی کے ماحول ہی میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ خالقیت جو انسان کا بلند ترین وصف ہونے کی وجہ سے اسے اللہ کے قریب لے آتی ہے اور ایجادیت جو ہر ترقی پسند تبدیلی کی پہلی شرط ہے اپنے پھولنے پھلنے کے لیے آزادی کا ماحول چاہتی ہے[2] لیکن خودسری اور آزادی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال آزاد شخصیت کو بے مہار شخصیت نہیں سمجھتے چنانچہ وہ جہاں مردِ حُر کی تعریف یہ بیان کرتے ہیں کہ:

دم بدم نو آفرینی کارِ حُر ۔۔۔ نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر
فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست ۔۔۔ جادۂ او حلقۂ پرکار نیست[3]

وہیں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ شخصیت جب تک تربیت کے مرحلوں سے نہیں گزرتی خالقیت اور ایجادیت کی طرف مائل نہیں ہو سکتی بہ الفاظِ دگر تربیت نا یافتہ شخصیتیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتیں۔ اقبال کے بقول

آدمی کا نفس، خود پسند اور اونٹ کے مانند ہے جو خود سر اور خود پرست ہوتا ہے لیکن اس کی مہار قابو میں رہ سکتی ہے اگر ایسا ہو تو یہی نفس خدمت شعار اور محنت کش بن کر صبر و استقلال کے ساتھ زندگی کے صحرائے پُر آشوب سے گزرتا ہوا انسان کو نیابتِ الٰہی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے یعنی اس منزل پر لے آتا ہے جہاں انسان خالقیت اور ایجادیت کی کاریگری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہوا منشائے ربانی سے ہم آہنگ ہو کر کائنات کی تکمیل و تزئین کے عمل میں حصّہ لیتا ہے اور خود کو "اللہ کا خلیفہ" ثابت کر سکتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس تربیت کی ضرورت ہے اس کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔

اطاعت

اختیار کی منزل جبر کو گلے لگائے بغیر نہیں ملتی۔ بظاہر اس قول سے خودی کی نفی کا پہلو نکلتا ہے لیکن حقیقتہً ایسا نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی کو وہ جبر کبھی قبول نہیں کرنا چاہئے جو اُسے کسی اقتدارِ اعلیٰ کے مفادات کا غلام بنا دے لیکن اقبال جس جبر کو پسند کرتے اس کا دوسرا نام ربّ العالمین کے بنائے ہوئے آئین کا پابند ہونا ہے جس کی ہر دفعہ کا منشا آدمی کو خود شکن قوتوں کے پنجے سے نکال کر نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز کرنا ہے۔ اس جبر کو اپنانا آدمی کے اختیار میں ہے کیونکہ اللہ کے عدل کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی اطاعت کیلئے بھی کسی کو استبدادی انداز سے مجبور نہیں کرتا اس لئے کسی خودی کے مضمحل ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ خودی کی یہ ادا بھی قابلِ غور ہے کہ :-

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز بھی ہو تو بے لذتِ نیاز نہیں[1]

کائنات کی ہر شے دینِ فطرت کی پابند ہے یہاں تک کہ :-

سبزہ بر دین نمو روئیدہ است
پائمال از ترک آں گردیدہ است[2]

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کا خیال ہے کہ آدمی کی شخصیت، دینِ فطرت یعنی اسلام کے دستور پر عمل کرنے سے ہی محفوظ رہتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے لہٰذا وہ ہدایت کرتے ہیں کہ :-

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو[3]

ضبطِ نفس

تربیتِ خودی کی راہ میں دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے اس مرحلے پر اطاعت آئینِ ربانی کے احساس و شعور کے تحت نفس کے خودسر تقاضے نظم و ضبط کی حدود میں آجاتے ہیں۔ جسم پروری کے لئے طمع اور خوف جن کی لاگ ڈانٹ آدمی کو ہر وقت گمراہ کرنے پر آمادہ رہتی ہے رفتہ رفتہ اس کے راستے سے دور ہو لیتے ہیں کیونکہ جب اور جہاں ان کی یورش ہوتی ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی حیات پرور قوتیں اس کی مدد کو آجاتی ہیں اور آدمی کے قدم صراطِ مستقیم پر جمے رہتے ہیں اس طرح خود سری اور خود پرستی پر مائل اس کا نفس مستقل مزاج۔ محنت کش اور صابر بن

جاتا ہے۔ وہ نظم و ضبط کی حدود میں آ کر ہلکی خوشی بارِ فرائض اٹھاتا ہے اور ایک عالمِ سرخوشی میں آگے بڑھتے بڑھتے نیابتِ الٰہی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی

اسلام کے مابعد الطبیعیاتی نظریات کی روشنی میں آدمی، نہ تو خدا کی اولاد سمجھا جاتا ہے اور نہ اس میں اللہ کے وجود کا کوئی جزو نظر آتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات، اللہ اور آدمی کے درمیان جس گراں قدر نسبت کا اظہار کرتی ہیں اس کا نام "زمین پر اللہ کی نیابت" ہے یا قرآن مجید کے الفاظ میں یہ کہ آدمی اللہ کا خلیفہ ہے۔

یہ منصب آدمی کو یونہی نہیں ملا۔ قرآن مجید کے ارشاد کے بموجب چونکہ اللہ کی مخلوقات میں صرف آدمی ہی صاحبِ علم ہے اس لئے بس وہی اس لائق ہے کہ اس منصب پہ فائز ہو سکے۔

دراصل آدمی اپنے مزاج کے الماسِ ناتراشیدہ میں احساس و اختیار کے وہ پہلو رکھتا ہے جنہیں اطاعتِ آئینِ ربانی اور ضبطِ نفس، منشائے الٰہی کے مطابق تراش کر اسے اللہ کا نائب بنا دیتے ہیں اور تب چشمِ فلک اس کی یہ شان دیکھتی ہے کہ :-

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

آرزوے بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات   چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد [۵۱]

اقبالؔ کے تصور کے بموجب "نائب اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ وہ انسانیت کا دُرِ مقصود اور بہ اعتبارِ جسم و نفس طرہ حیات یعنی مکمل ترین الیغو ہے، ہماری حیاتِ نفسی کی پراگندگی اس کے وجود میں پہنچ کر ہم آہنگی بن جاتی ہے۔ اس کی ہستی میں بلند ترین قوت کا رشتہ بلند ترین علم سے ہوتا ہے اور اس کی عقل و جبلت نیز فکر و عمل گھُل مل کر ایک ہو لیتے ہیں۔ وہ شجرِ انسانیت کا آخری ثمر ہے جس کا وجود ارتقائے پر مصائب کی تمام آزمائشوں کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ آخر الامر اسے ہی ظہور پذیر ہونا ہے اور وہی نوعِ انسانی کا حقیقی حکمران ہے۔ اس کی سلطنت زمین پر اللہ کی سلطنت ہے۔" [۵۲]

اقبالؔ عصرِ حاضر کے لئے اسی نائبِ الٰہی۔ اسی سوارِ اشہب دوراں اور فروغِ دیدۂ امکاں کے منتظر ہیں جس کا ظہور شورشِ اقوام کی خاموشی کا باعث ہوگا اور جو جنگ بازوں کو پیغامِ صلح دے کر قانونِ اخوت سے کی روشنی میں زندگی کی نئی تعبیر پیش کرے گا۔ کیونکہ:۔

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نظر زلزلۂ عالم افکار [۵۳]

گیارہواں باب

شرحِ اسرارِ اسمائے علیِ مرتضیٰ رضؓ

اس باب کا موضوع حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے ناموں کی تشریح ہے۔
اقبالؔ کے بقول حضرت علیؓ اطاعتِ آئینِ الہٰی اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گزر کر اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ اللہ نے انہیں "اپنا ہاتھ" اور حضور نبیِ کریمؐ نے "دروازہ شہرِ علوم" فرمایا۔ ان کی ذات یداللّٰہی کی مظہر ہے، اسی وجہ سے وہ خیبر کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کا دروازہ توڑ کر اُسے فتح کر سکے اور وہی حشر کے دن حوضِ کوثر پر پیاسوں کو سیراب کریں گے۔

اقبالؔ کے تصور کے مطابق نفس کے سرکش تقاضے "خاک" یعنی مادے کی مخصوص سرشت کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ان کو مطیع کرنے کے لئے جسم کے منہ زور مطالبات پر قابو پانا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے چونکہ انہیں اپنے بس میں کر لیا تھا، اس لئے ان کا لقب ابوتراب (خاک کا باپ) ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی مادی قوتوں کا آقا بن جاتا ہے اور ان سے جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد ہی وہ اپنی قوت کے ممکنات کا اظہار کر سکتا ہے اور اگر مزاجِ جہاں اس سے موافقت نہ کرے تو موجودات کی ترکیب ہی بدل کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ اسی اعجاز گر مقام پر پہنچ گئے تھے اور یہ انہیں کی ذات والاصفات تھی جس کے لئے ڈوبتے سورج کو وقت عصر تک واپس آنا پڑا تھا۔ اس واقعہ کو روایتوں میں "رجعتِ خورشید" یا "عودِ شمس" کا نام دیا گیا ہے۔[1]

وہ چونکہ اقلیمِ تن کو فتح کر چکے تھے، اس لئے کرارا اور خود دار تھے اور اسی لئے جہادِ زندگانی کے ہر میدان میں فتح ان کے قدم چومتی تھی۔

اقبالؔ کے بقول حضرت علی مرتضےٰؓ کی ذاتِ گرامی بہ اعتبارِ پیمانۂ حیات انتہائی تربیت یافتہ شخصیت کی حامل ہے اور ان کے ناموں کی اہمیت اور معنویت سمجھنے کے لئے زندگی کے رموز سے واقف ہونا ضروری ہے۔

بارہواں باب

حکایت

مَروؔ کا ایک نوجوان حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ کی خدمت میں آیا اور دشمنوں کے ظلم کا شکوہ کیا۔

حضرت ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلالی الہجویریؒ غزنی کے رہنے والے تھے۔ آخر عمر میں آپ کا قیام لاہور میں تھا۔ ۱۰۷۲ء سے ۱۰۷۶ء تک کے درمیان کسی سنہ میں وفات پائی۔ مزار مبارک لاہور میں ہے۔ آپ کی شاہکار تصنیف "کشف المحجوب" تصوف پر قدیم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے جس کا منشا تصوف کے مکمل نظام کو پیش کرنا اور دینیاتی معتقدات کو تصوف کے ترقی یافتہ تصورات سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ آپ نے اس تصور کی سختی سے مخالفت کی ہے کہ انسان کی شخصیت وجود باری میں ضم ہو کر معدوم ہو سکتی ہے۔ آپ کی تعلیمات کا مرکزی خیال شخصیت کی استقامت اور مضبوطی ہے[1]

اس باب میں بھی موضوع حکایت کے لطور پیش کیا گیا ہے۔ اگلے اوراق

میں وضاحت کے لئے دو حکایتیں اور بھی بیان کی گئی ہیں۔

اقبال استحکامِ خودی اور صلابتِ کردار کے نقیب ہیں اور ان کی حقیقت و اہمیت بہر طور ظاہر کرتے ہیں مثلاً :-

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی[1]
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات[2]
اے مرغکِ بے چارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[3]

ان تصورات کی روشنی میں اقبال پر سید ہجویری کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے مخصوص نقاطِ فکر و نظر مغربی مفکرین بالخصوص نطشے کی دین نہیں ہیں۔ ان کے تصورات کو نطشے کا عطیہ کہنے کی غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اقبال اور نطشے کے چند میلاناتِ فکر میں قدرے

مشابہت نظر آتی ہے مثلاً :- (۱) دونوں افلاطون کی مذمت کرتے ہیں۔
(۲) دونوں کے خیال کے بموجب آدمی کی شخصیت کو تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔
(۳) صلابتِ کردار کے موضوع کو دونوں نے ہیرے اور کوئلے کی کہانی سے واضح کیا ہے۔

اس مشابہت کے باوجود اقبال اور نطشے کے تصورات میں کوئی میل نہیں کیونکہ نطشے افلاطون کو اس لئے بُرا سمجھتا ہے کہ افلاطون سقراط کا پیرو ہے اور سقراط کے پیش کردہ نظامِ فکر میں جبلتوں کی رہنمائی کے بجائے عقل کے اشارات کو رہبر مانا گیا ہے جو نطشے کو پسند نہیں لیکن اقبال کی نظر میں افلاطون کے تصورات اس لئے قابلِ مذمت ہیں کہ وہ حیات کے بجائے موت اور فعال زندگی کے بجائے رہبانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ شخصیت کی تربیت کے معاملے میں نطشے کے بقول آدمی کو تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے جن میں علی الترتیب اونٹ، شیر اور آدمی کے بچے کی خصوصیات ملتی ہیں لیکن اقبال کی نظر میں یہ مرحلے اطاعتِ آئینِ الٰہی، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے ہیں۔ اب لے دے کر ہیرے اور کوئلے کی کہانی باقی رہ جاتی ہے سو اس جرم کی پاداش میں کہ اقبال نے اُسے دوہرا دیا ہے اس کے تصورات کو نطشے کا عطیہ کہہ دینا ایک استبدادی فتوے کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس باب میں یہ دلچسپ حقیقت بھی ظاہر کی گئی ہے کہ خودی کی تربیت کیلئے عداوتوں اور مخاصمتوں کا ماحول مبارک اور مفید ہے کیونکہ اگر شخصیت کمزور نہیں ہے تو رکاوٹوں سے ہراساں نہیں ہوگی۔ چڑھتے دریا راستے کی چٹانوں کو نظر میں نہیں لاتے بلکہ آبشاروں، پناتوں اور بجلی کے ذخیرے مہیا کرتے ہوئے

آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چوٹ کا ڈر اور شکوہ شیشے کو ہو تو ہو پتھر کو نہیں ہوتا لہٰذا اگر شخصیت بجود محکم ہے تو دشمنی کے ماحول کو اپنے لئے سازگار بنا لیتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ :۔

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است[۵]

حکایت

اس چڑیا کی جو پیاس سے بیتاب تھی

(اس حکایت کا موضوع وہی ہے جو پچھلی حکایت کا تھا)

ہیرے اور کوئلے کے اجزائے ترکیبی یکساں

ہیرے اور کوئلے کی کہانی: ہوتے ہیں اس کے باوجود ہیرا قیمتی سمجھا جاتا ہے اور کوئلے کی قدر نہیں ہوتی۔ پچھلی دو حکایتوں کی طرح یہ کہانی بھی استحکامِ خودی اور صلابت کردار کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ اقبالؔ سے پہلے نطشے نے ہیرے اور کوئلے کا مکالمہ تحریر کیا تھا جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے :

"اتنے سخت کیوں ہو؟ انگیٹھی کے کوئلے نے ایک دفعہ ہیرے سے کہا: "کیا ہم قریبی رشتے دار نہیں ہیں؟

"تم اتنے نرم کیوں ہو؟ اے میرے بھائیو! میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تم میرے بھائی نہیں ہو؟ اتنے نرم ایسے سپر انداز، اتنے خود سپرد کیوں ہو۔ تمہارے دل میں اتنا تردد اور گریز کیوں ہے؟ تمہاری نظر کا نصیب اتنا مختصر کیوں ہے؟

جب تک تم یہ نہ چاہو گے کہ قضائے بے زر دین جاؤ کیا تم کبھی بھی میرے ساتھ کچھ تسخیر کر سکو گے؟

اور اگر تمہاری سختی چمک نہ سکے گی کاٹ نہ سکے گی ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکے گی تو کیا تم کبھی بھی میرے ساتھ کچھ تخلیق کر سکو گے؟ کیونکہ خالق تو بھی سخت ہوتے ہیں تمہیں تو اس میں لطف آنا چاہیئے کہ صدیوں پر اپنا ہاتھ یوں جماؤ جیسے موم پر جماتے ہیں۔ تمہیں تو اس میں لطف آنا چاہیئے کہ صدیوں کی منشا پر اپنا نقش اس طرح کندہ کر دو جیسے کانسی پر کیا جاتا ہے۔ کانسی سے زیادہ سخت۔ اس سے زیادہ شان دار کیونکہ صرف شان دار ہی پوری طرح سخت ہوتے ہیں۔

یہی فرمانِ جدید۔ اے میرے بھائیو! میں تم پر نافذ کرتا ہوں کہ سخت بن جاؤ"۔ ۱

تیرھواں باب

حکایتِ شیخ و برہمن اور مکالمہ گنگا و ہمالہ اس معنی میں کہ روایاتِ مخصوصۂ ملیہ پر گرفت مضبوط رکھنے سے حیاتِ ملیہ کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

زیرِ نظر باب میں مکالمہ شیخ و برہمن کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون مثنوی رموزِ بے خودی میں بیان ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اسی باب کے دوسرے جزو یعنی مکالمہ گنگا و ہمالہ کے مطالعہ کے بعد یہاں اس کے مقام کی اہمیت اس اعتبار سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ملت کی مخصوص

روایات کا استحکام واحترام تسلسلِ حیاتِ ملّیہ ہی کے تحفظ کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ فرد کی خودی کو بھی محفوظ رکھتا ہے کیونکہ فرد بہر حال جماعت ہی کا ایک رکن ہوتا ہے۔

روایت کے معانی میں' پانی کھینچنا اور دوست کو پیش کرنا۔ اونٹ پر مشک باندھنا، رسّی بٹنا۔ دوسرے کے الفاظ دہرانا۔ رشتہ۔ تاریخ۔ تذکرہ۔ حدیث اور حکایت شامل ہیں لہٰذا ان کی روشنی میں "روایت" کسی مخصوص گروہِ انسانی کا وہ رویّہ معلوم ہوتی ہے جو وہ اپنے سماجی شعور کی تحریک پر مسلسل ظاہر کرتا یا پسند کرتا ہو۔ نیز ہر روایت کا آغاز حیات کی کسی نہ کسی قدرِ گراں کے تحفظ واجرا کے لئے نظر آتا ہے مثلاً عربوں کی روایتِ مہماں نوازی ہی کو لیا جائے تو اس کی تہہ میں "پانی کھینچ کر پیش کرنا" جھلکتا نظر آئے گا کیونکہ ایک صحرا نورد قبائلی معاشرے سے زندگی کا پہلا مطالبہ یہی ہو سکتا ہے کہ تپتے ہوئے ریگستان میں آدمی' دوست اور دشمن کا امتیاز کئے بغیر ہر پریشان حال مسافر کو ایک کوزۂ آب پیش کر دے اور اس کی مدارات کو فرض سمجھے ورنہ ہر دشت پیما کا مقدر پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنا ہوگا۔

اپنے منبع کے قریب سب ہی روایتیں صحت مند اور حیات پرور ہوتی ہیں لیکن اس سے دور ہٹتے ہٹتے رسوم میں تبدیل ہو کر حیات کے مطالبے پورے کرنے کے بجائے اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہیں اور ان کی عطا کردہ سرگشتگی انسان کے لئے دردِ سر بن جاتی ہے۔

روایت کے ضمن میں اکثر رسوم کا اندراج ہو جاتا ہے لیکن اقبال ان کا

فرق جانتے ہیں اور اس باب میں ایک روایت کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کار روائی شناخت کے مرحلے کو آسان بھی کر دیا ہے۔

ان کے خیال کے مطابق ملّتِ اسلامیہ کی روایات کے باب میں ترکِ رہبانیت سرِ فہرست ہے کیوں کہ ایک ملّت کے بطور مسلمانوں نے عقدۂ "بود و عدم" میں اُلجھنا کبھی پسند نہیں کیا اور نہ کبھی فعال زندگی سے دستبرداری کا رویّہ اپنایا ہے۔ ان کی مخصوص روایت یہی ہے کہ طائفِ اوجِ سما ہونے کے بجائے وہ زمین کو چار چاند لگانے کی فکر میں رہے ہیں۔ روایت کے صحیح خد و خال پہچاننے کے لئے یہ ایک مثال کافی ہے۔

اس باب کا دوسرا حصّہ "مکالمۂ گنگا و ہمالہ" ہے جس کے مطالعہ سے شبہ ہو سکتا ہے کہ اقبال ان اشعار میں اپنے نظریۂ حرکت و عمل کے خلاف اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمالہ اٹل ہونے کے باوجود بالیدگی سے عاری نہیں ہوا۔ وہ بھی کسی سوزِ سعی و جہد سے جلا ہے تب کہیں اس کا سینہ مخزنِ لعل و گوہر بنا۔ ایک خاموش جدّ و جہد کے نتیجے ہی میں اس کی ہستی کو یہ رفعت نصیب ہوئی ہے کہ اس کا دامن بسترِ مہ و پرویں ہو سکا۔

ان اشعار سے یہ حقیقت البتّہ ظاہر ہوتی ہے کہ اگر حرکت اور سعی و عمل کا رُخ فرد کی شخصیت یا ملّت کی جمعیت کو پراگندہ کر کے اُسے کالعدم کر دینے کی طرف ہے تو ایسی کوشش بدنام کنندۂ نامِ جدّ و جہد ہے۔

چودھواں باب

مسلمان کی حیات کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور وہ جہاد جس کی محرک ہوسِ ملک گیری ہو مذہبِ اسلام میں حرام ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
"لادیں" ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک[1]

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ اقبال کی تعلیمات خوں ریزی اور ہلاکت آفرینی کا پیغام دیتی ہیں۔ اقبال شاہینیت یعنی جھپٹ جھپیٹ کے مبلغ ہیں اور طاقت کے بل پر بالادستی حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں یا الفاظِ دگر وہ طبعاً فسطائی ہیں[1] اور مسلمانوں کو غیر مسلموں پر بزورِ شمشیر مسلط دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ

خیال ایک بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور اس غلط فہمی کا شکار وہ حضرات ہو جاتے ہیں جو اقبال کو نطشے کا مقلد سمجھتے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان تمام بحثوں سے قطع نظر جو اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے ہوتی رہتی ہیں، اسرارِ خودی کا یہ باب اور مذکورہ بالا چند اشعار ہی اقبال کو اس الزام سے بری کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

یہاں ایک بار پھر نطشے اور اقبال کے نظریات کا فرق سامنے آجاتا ہے جسے بیان کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال طاقت کو پسند کرتے ہیں لیکن وہ البتہ دامانِ رحمۃ للعالمین اور وارفتۂ سوز و سازِ عشق ہونے کی وجہ سے وہ ظلم کو ناپسند کرتے ہیں جبکہ نطشے سرے سے رحم کی صفت کو قابلِ نفرت اور ظلم کو پسندیدہ سمجھتا ہے

۲۔ اقبال حلم و مروت اور صبر و رعایت کو پسند کرتے ہیں مگر عفوِ بے جا کے قائل نہیں اور نطشے! وہ حلم و مروت تو کجا کمزور کو جینے کا حق ہی نہیں دیتا

۳۔ اقبال شخصیت کو مظہرِ جمال و جلال دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن نطشے کے بقول طاقت ہی مظہرِ حسن و خیر ہے اور ان دونوں فلسفیوں میں یہ فرق اس لئے ہے کہ :۔

اقبال حیات بعد الممات کے قائل ہیں اور نطشے اس کا منکر، نیز اقبال عاشق ذاتِ الٰہی ہیں اور نطشے ناواقفِ مقامِ کبریائی۔

نطشے کے تصورات کے بموجب "عظیم مقاصد" کے لئے اخلاقی قیود سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ زنجیریں اتار پھینکنی چاہئیں، اقتدار سے باغی ہو جانا چاہئے، آج کی زندگی ہی کو زندگی ماننا چاہئے اور اسے ہولناک جانتے ہوئے بھی اچھا سمجھنا چاہیئے۔

عظمت، قوت اور حسن کا راستہ کاٹنے والی ہر شے کو تباہ کر دینا چاہیئے نیز گناہ، ضمیر، جہنم اور موت کے ڈر کا بھوت سر سے اتار دینا چاہیئے۔

نطشے کے بقول رحم دلی ایک بیماری ہے یا خود غرضی جو جدّ و جہد کے راستے کی رکاوٹ ہے اور اسی کے باعث (معاذ اللہ) خدا مر چکا ہے لہٰذا آگہی وہ نیکی ہے جس کی قیمت بے قیاس ہے لہ

اس "فرمانِ جدید" کے پیشِ نظر یہ سمجھ لینا دشوار نہیں کہ نطشے کا فوق البشر یا مردِ کامل ایک غضبناک، ظالم، سادیت پسند لہ اور تخریب کار بہیم جو ہے جس کی زندگی کا مقصد تخریب برائے تخریب کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس کے بخلاف، اقبال کے نقطۂ نظر سے مردِ کامل یا مومن آئینِ ربانی کا پابند ہو کر حدودِ شریعت یعنی اخلاقی قیود میں رہتا ہے، وہ آج کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی پر یقین رکھتا ہے اور خودی کو عشق و محبت سے مستحکم کرتا ہے اس کا مردِ کامل، مغلوب نہ ہونے والا ایک خود شناس مرکزِ توانائی ہے جس کی خاص صفت حلم اور بردباری ہے وہ خدا کا منکر نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد، زمین پر خدا کی سلطنت قائم کرنا ہے اور وہ طاقت بھی اسی لئے پسند کرتا ہے کہ اپنے اس مقصد کے راستے کی ہر رکاوٹ کو آسانی سے دور رکھ سکے تلہ وہ کسی بھی مسرت کے حصول کے لئے جلتے سلگتے شہروں میں بانسری بجانا پسند نہیں کرتا بلکہ صرف اُسے نابود کرتا ہے جو ناقابلِ اصلاح ہو چکا ہو۔ اقبال کے مردِ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے کیونکہ وہ غالب اور کارکشا ہوتا ہے۔ وہ دلِ بے نیاز رکھتا ہے۔ اس کی اُمیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوتے ہیں اور اس کی شان یہ ہوتی

ہے کہ :-
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[۱۵]

ان اشارات کی روشنی میں اقبال اور نطشے کے افکار میں کوئی قابلِ ذکر مطابقت تلاش کرنا بے سود ہے اور یہ کہنا کہ اقبال فسطائیت پر مائل تھے۔ اقبال اور فسطائیت دونوں سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے۔

اس باب کے عنوان میں اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے بموجب ملک گیری اور کشور کشائی کی ہوس پوری کرنے کے لئے میدانِ جنگ آراستہ کرنا حرام ہے۔ ایسی جنگوں کو جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے بقول تو حقیقت یہ ہے کہ :-

گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند

ان اشعار میں شہاب الدین شاہجہاں کا ذکر کیا گیا ہے[۱۵] شاہجہاں دکن کی جنگوں میں فتح یاب ہونے کے لیے، حضرت میاں میر رح سے دعا کا طالب گار ہوا تھا لیکن حضرت شیخ نے اسے دعا دینے کے بجائے یہ بتایا کہ وہ اپنی ہوسِ ملک گیری کو آرزوئے جہاد کہہ کر غلط فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اقبال بھی اس قسم کے "مجاہدات" کی تبلیغ نہیں کرتے، انہیں خودکشی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ :-

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید[۱۳]

پندرھواں باب

میر نجات نقش بند المعروف بہ بابائے صحرائی کی نصیحت جو ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے تحریر کی گئی۔

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

پروفیسر نکلسن کے بقول "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے میر نجات نقش بند کا فرضی نام اپنے لئے ہی استعمال کیا ہے۔" ؎ :۔

اس باب کا موضوع عقل و دل یعنی علم و عشق کی حقیقت ہے اقبال کے تصورات کے بموجب وہ علم جو عشق سے بیگانہ اور سوزِ دل سے عاری ہو حدودِ حس سے باہر نہیں جاسکتا۔ وہ ظاہری کو دیکھتا ہے باطن تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سطح کے نیچے کیا ہے اسی لئے اس کے اندازے غلط اور فیصلے خطرناک ہوتے ہیں۔ اپنے قیامِ یورپ کے دوران ہی اقبال علم کے اس روپ کو دیکھ چکے تھے چنانچہ انہیں کہنا پڑا کہ :۔

:۔ یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اسلام آباد (پاکستان) کے قریب ایک مزار ہے جس پر مزار "بابائے صحرائی" لکھا ہوا ہے۔ راوی سید وقار الدین صاحب چاند پوری

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا[۹۱]

اس میں شک نہیں کہ یورپ اور امریکہ نے سائنس اور انجنیئرنگ کے طفیل اتنی ترقی کرلی کہ آج گوری قوم کے قدم چاند پر پہنچ گئے ہیں لیکن اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انہی علم و ہنر نے صنعتی انقلاب[۹۲] کی گود میں اس سرمایہ دارانہ سامراج[۹۳] کو جنم دیا تھا جو دنیا کی بیشتر آبادی کو اپنا غلام بنا چکا ہے۔

عشق اور سوزِ دل سے بیگانگی کے باعث یہ علم و ہنر آدمی کی جگہ مشین کو دے چکے ہیں۔ اُن کے پروردہ نظام میں جو کچھ ہے مشین ہے بلکہ یوں کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ آدمی بھی مشین بن گیا ہے، ایک جان دار مشین بن گیا ہے جسے جانور بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ جانور تو وفادار اور بامروّت ہو بھی سکتے ہیں لیکن :-

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات[۹۵]

یہ جان دار مشینیں مل جل کر نہیں رہ سکتیں۔ شانے سے شانہ ملا کر کام نہیں کرسکتیں، یہ صرف کچل سکتی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کرسکتی ہیں، پیس سکتی ہیں۔

اس دور کی بڑی بڑی جنگوں کے جتنے میدان سجے ہیں ان میں یہی تماشا نظر آیا ہے کہ بڑی مشینوں نے چھوٹی مشینوں پر قابو پاکر وحشتوں کے وہ وہ فرمان جاری کیے ہیں جن کی زد سے معاشرت و معیشت۔ سیاست و تجارت۔ مذہب و عقیدت کچھ بھی محفوظ نہیں رہا گویا نوبت بہ اینجا رسید کہ اقبال کے بقول دوزخیوں کو اپنی دوزخ اس جلتی سلگتی دنیا سے زیادہ اچھی محسوس ہونے لگی اور وہ کہہ

اٹھے کہ:-

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری | رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتا ہے خدا یاد
پوجا بھی ہے بے سود نمازیں بھی ہیں بے سود | قسمت ہے غریبوں کی فقط نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عماراتِ فلک بوس | ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے | سیراب ہے پرویز جگر تشنہ ہے فرہاد
یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت | جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ کی ایجاد
اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز | سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

اس کشت و خون کا انسانیت کی اصلاح سے دور کا واسطہ نہیں۔ یہ جنگیں تو نطشے کے مردانِ کامل نے اپنے اپنے مفاداتِ مخفیہ کے تحفظ کے لئے شروع کی تھیں جن کی آگ سے امن پسند اقوام کے کھیت کھلیان بھی محفوظ نہ رہ سکے، یہی ہونا بھی تھا کیوں کہ عشق بیزار اور مروّتِ ناشناس علم و ہنر ایک مغلوب الغضب ۔ سادیت پسند، ظالم اور تعاون ناشناس سماج کو جنم دے کر اس کی پرورش کرنے پر مجبور رہیں۔

اقبال ایسے علم سے اس لئے بیزار ہیں کہ اسلام اس سے دست بردار ہونے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ صرف اس علم کو نوازتا ہے جس سے عشق و محبت، حلم و مروّت اور برادری برابری کے جذبات فروغ پائیں۔

اقبال کے تصور کے بموجب علمِ مسلم دنیا کے لئے حریت، اخوت اور مساوات کی برکتیں لاتا ہے کیونکہ وہ علمِ اشیاء (سائنس) کا رشتہ دین سے قائم رکھتا ہے۔ لہٰذا اقبال علم و ہنر کو مائل بہ فتوحات ہونے سے پہلے سلامتی کے راستے سے

واقف ہوتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اس باب کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں استحکامِ خودی کی تلقین کرتے ہوئے علم اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور تمثیل کے بطور صاحبِ حال حضرت شمس تبریز رح اور اسیرِ قال مولانا جلال الدّین رومی رح[۱] کا وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جس نے مولوی کو عشق کی راہ پر لگا دیا۔

دوسرے اور تیسرے حصّے میں اس تکلیف دہ حقیقت کا اظہار ہے کہ آج مسلمان بھی علمِ دین کو نظر انداز کرنے کے باعث صراطِ زندگی سے بھٹک گئے ہیں اور ان دنوں ان کا حال یہ ہے کہ :-

صوفی کی شریعت میں فقط مستیِ احوال
ملّا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار[۲]

لہٰذا اُن کے بقول یہ سوال قابلِ غور ہے کہ :-

چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما
رُخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما[۳]

سولھواں باب

الوقتُ سیفٌ (وقت تلوار ہے)

جو تھا نہیں ہے۔ جو ہے، نہ ہوگا یہی ہے اندازِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

(بالِ جبریل)

اقبالؔ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اُن کا کارنامہ خودی کی تفسیر ہے۔ لیکن یہ اُن کے کارنامے کا ایک رُخ ہے۔ اس کا دوسرا رُخ ان کا تصورِ مکان و زماں ہے۔ یوں بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں تصورات

لازم ملزوم ہیں۔ عرفانِ خودی کے لئے عرفانِ زمانہ درکار ہے اور زمانے کو سمجھنے کے لئے عرفانِ خودی لہٰذا جہاں اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و عرش و کرسی — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی[1]

وہیں زمانے کے اس دعوے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ :۔

بستہ ہر تدبیر با تقدیر من — ناطق و صامت ہمہ نخچیر من
غنچہ اندر شاخ می بالد ز من — مرغک اندر آشیاں نالد ز من
دانہ از پرواز من گردد نہال — ہر فراق از فیض من گردد وصال
ہم عتابے ہم خطابے آورم — تشنہ سازم تا شرابے آورم
من حیاتم من مماتم من نشور — من حساب و دوزخ و فردوس و حور
آدم و افرشتہ در بند من است — عالم شش روزہ فرزند من است
ہر گلے کز شاخ می چینی من ام — اُم ہر چیزے کہ می بینی من ام
در طلسم من اسیر است ایں جہاں — از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں[2]

اقبال کے بقول "اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسئلے ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا مطمحِ نظر یہ ہو اس میں زمان و مکان کا سوال دراصل زندگی اور موت کا سوال ہے"[3] زمانے کا دوسرا نام تقدیر ہے۔

"زمانے کو جب عضوی کل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآن کی زبان میں اسے تقدیر کہتے ہیں۔ لفظ تقدیر کی مسلمانوں کے یہاں اور غیر مسلموں میں بھی بالکل غلط تعبیر پیش کی گئی ہے۔

تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جب کہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو سلسلۂ اسباب کے پھندے سے آزاد ہو چکا ہو اور فہم منطقی جس پر اپنی مخصوص شکل عاید کر دیتی ہے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقدیر وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں نہ کہ وہ جس کا ہم تفکر کرتے ہیں یا جس کا ہم حساب لگاتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ شاہ طہماسپ اور ہمایوں کیوں ہم عصر تھے تو میں اس کی کوئی علت پیش نہیں کر سکوں گا۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت کی ماہیت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ مستقبل کے لامتناہی امکانات میں ہمایوں اور طہماسپ کی زندگیاں جو امکانات ہی سے عبارت تھیں ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوں۔

زمانے کو جب تقدیر خیال کیا جاتا ہے تو وہ اشیاء کی ماہیت بن جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ہے: خلق کل شی وقدرہ تقدیرا۔ یعنی اللہ نے ہر چیز کو خلق کیا۔ پھر اس کے لئے ایک تقدیر یا اندازہ مقرر کیا لہ لیکن کسی شے کی تقدیر کوئی بے درد نصیب نہیں جو باہر سے سخت گیر آقا کی طرح حکم چلا رہا ہو۔ یہ تو کسی شے کی داخلی گہرائی اور رسائی کا نام ہے۔ ان ممکن الحصول امکانات کا نام ہے جو اس کی فطرت کی گہرائی میں ہوتے ہیں اور کسی جبر کے بغیر اپنے آپ کو واقعیت میں مسلسل تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا "مستقبل" ہر فرد کیلئے ایک کشادہ میدانِ امکانات کے بطور

موجود ہے۔ یہ پہلے سے کسی مرتبہ اور محدود نظام وقت کی طرح نہیں پایا جاتا (کیونکہ) وقت یکساں لمحات کی تکرار کا نام نہیں جو شعوری مشاہدات کو وہم بنا ڈالتا ہو۔ یہ تو ایک تخلیقی پرور کارکن ہے جو آزاد فعالیت بیز نشوونما کا میدان مہیا کرتا ہے[۱]۔

اگر ہم ماضی، حال اور مستقبل کو وقت کیلئے لازمی قرار دے لیں تو ہمارے سامنے وقت کی تصویر ایک سیدھی شاہراہ کی سی ہو گی، جس کا کچھ حصہ گویا ہم طے کر آئے ہیں اور کچھ طے کرنا باقی ہے۔ اس وقت کا تصور ایک زندہ اور تخلیقی پرور حرکت کے بطور سامنے نہیں آتا بلکہ ایک جامد امرِ مطلق کی طرح نظر آتا ہے جو پوری طرح صورت پذیر کائناتی واقعات کے منظم تعدد کا حامل ہو اور دیکھنے والے کے سامنے ان واقعات کو فلم کی تصویروں کی طرح مسلسل پیش کر رہا ہو[۲]۔

اس میں شک نہیں کہ وقت کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات[۳]

لیکن دراصل:۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات[۴]

اقبال زمانے کی رَو کو شب و روز سے مستغنی اور وقت کے مروجہ پیمانوں سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم جب وقت کے پیمانوں کی بات کرتے ہیں تو دراصل "زمان" کو "مکان" فرض کر بیٹھتے ہیں۔ یہ تصور غلط ہے۔ زمانہ تو بس ایک رَو ہے یعنی ایک آزاد تخلیق پرور حرکت جس کا تجربہ ہمیں (شعوری طور پر) اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے[۵]۔

ظاہر بیں نگاہیں اشیائے کائنات کی سطح کو دیکھ کر سکون و ثبات کے تانے بانے میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور زمانے کو مقید و محدود سمجھ بیٹھتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ مظاہراتِ خلق میں تکرار اور اعادے کا تماشا دیکھتی ہیں، لیکن وجدان کو اس کے بخلاف ہر ذرۂ کائنات متحرک اور سیماب پا نظر آتا ہے جس کے باعث :-

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[۱۵]

زمانے کی آزاد اور تخلیق پرور رو بڑی تیز، جولاں، دوررس اور ازل سے ابد تک رم یک نفس ہے۔ یہ تخلیق طراز حرکت ہمیشہ تعمیر و تشکیل میں مصروف رہتی ہے کیونکہ :-

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں[۱۶]

خودی اور زمانے میں گہرا ربط ہے۔ زمانے سے ہم عناں ہونے کے بعد ہی خودی شہسوارِ ابلقِ ایام بنتی ہے کیوں کہ زمانے کی تخلیق پرور حرکت سے زور آزمائی خلافِ منشائے الٰہی ہے البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب کوئی مخصوص سلسلۂ روز و شب، کوئی ایک پیمانۂ لیل و نہار بذاتِ خود زمانے کے خلاف ہو جائے یعنی رجعت پسند ہو کر جامد اور غیر تخلیقی چلن اپنائے تو خودی اس کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہے۔

حدیثِ بے خبراں ہے کہ با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز[۱۷]

کا مفہوم یہی ہے اور اس شعر میں زمانے سے مراد ایسا ہی کوئی پیمانۂ لیل و نہار ہے۔

اس باب کا عنوان "الوقتُ سیفٌ" حضرت امام شافعیؒ کا مقولہ ہے۔ امام موصوف آئمہ اربعہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی ہے اور آپ کا دورِ حیات ۱۵۰ھ سے ۲۰۴ھ تک رہا ہے۔ آپ حضرت امام مالکؒ کے شاگرد تھے اور فہم فقہ و حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ شاعری۔ عروض و نحو۔ لغت اور تاریخ میں بھی کمال حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علمِ نجوم بھی سیکھا مگر اس سے کام نہیں لیا۔

وقت کے رمز کو جاننے کے لئے اس باب میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔

لی مع اللہ وقتٌ لا یسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ ولا ملکٌ مقربٌ

(مجھے ذاتِ باری کے ساتھ ایسا وقت نصیب ہوا کہ اس میں نہ نبی مرسل اور نہ مقرب فرشتہ بار پا سکتا ہے) لہ

اس حدیث سے حضور نبی کریمؐ کے اس رتبے کا پتا ملتا ہے جب آنحضرتؐ زمانِ ربانی کی ان وسعتوں میں پہنچ لئے تھے جہاں ماضی، حال اور مستقبل اس اکائی کے طور سامنے ہوتے ہیں جسے ایک "اب" کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور جس میں دیکھنے والا جملہ ممکنات و واقعاتِ عالم کو بہ یک جنبشِ نگاہ دیکھ لیتا ہے۔

کسی اور نبیِ مرسل یا مقرب فرشتے کا اس منزل تک پہنچنا اس لئے ناممکن کہا گیا ہے کہ زمانِ ربانی کے ازدحام جلوہ کے روبرو از خود رفتہ نہ ہونا انتہائی مستحکم اور مکمل شخصیت کے علاوہ اور کس کے بس کی بات ہے۔ ایسی شخصیت حضور نبی کریمؐ کی ذات ہی تھی کیونکہ مولانا عبدالقدوس گنگوہی کے بقول یہ کارنامہ

صرف حضورؐ ہی سے ظاہر ہوا ہے کہ معراج کی انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچنے کے باوجود آپ خود سے نہیں گزرے بلکہ اس ازدحام جلوہ میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اسی کارگاہِ عناصر امی دنیائے آب و گل میں فیوضِ رسالت عام کرنے کیلئے واپس آگئے۔

حضرت امام شافعیؒ کے بقول "وقت تلوار ہے" جس کی کاٹ کا جواب نہیں لیکن تلوار حریف کو کاٹتی ہے وہ کوئی بے ہنر ہی ہوتا ہے جو اپنی تلوار سے خود زخمی ہو جائے متذکرہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود گیر شخصیتوں اور زمانے میں مخاصمت نہیں ہوتی ایسی حالت میں وقت کی تلوار اپنا قبضہ ان حضرات کو خود پیش کر دیتی ہے کبھی عصائے موسیٰؑ بن کر۔ کبھی اللہ کے چلائے ہوئے تیر کی شکل میں اور کبھی ذوالفقارِ حیدری کی صورت میں یہ تلوار اجرائے منشائے الٰہی کے لئے ان حضرات کی حلیف بن جاتی ہے۔

دوسری حدیث حسبِ ذیل ہے:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰه

زمانے کو برا مت کہو بے شک زمانہ اللہ ہے۔ ۵

اور مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث اس طرح موجود ہے۔

" وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يُؤْذِيْنِيْ ابْنُ اٰدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ بِيَدِيْ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا وند تعالیٰ فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا زمانے کو برا کہہ کر مجھ کو برا کہتا ہے۔ حالانکہ

زمانہ میں ہی ہوں ۔ میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے میں ہی دن رات کو بدلتا رہتا ہوں ۔ (بخاری و مسلم) ؎



دُعا

اس ظاہر پرست دنیا میں دل کی بات کوئی نہیں سنتا ۔ دل، انسان کو واقعی انسان بنا کر عشق کے ذریعہ عقل کی چیرہ دستیوں پر قابو پانا چاہتا ہے لیکن اس کا مشورہ ہنس کر ٹال دیا جاتا ہے ۔ آدمیوں کے گروہ کے گروہ پتھروں کے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں یا درندوں کے غول ۔ اس حالت میں گنے چنے دل والے ہر دروازے پر دستک دیتے نظر آتے ہیں، آوازیں لگاتے سنائی دیتے ہیں ۔ "للہ ہوش میں آؤ خود کو پہچانو، لیکن یہ آوازیں صدا بصحرا ہوتی ہیں ۔

دولتِ دل غارت کیے سب ایک دوسرے سے اجنبی بنے رہتے ہیں۔
ان اشعار میں اقبال اسی احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ بھری محفل میں ایسے اکیلے ہیں جس کا کوئی رازدار نہیں کوئی غمگسار نہیں۔ اس حالت میں یہ دعا ان کے دل سے نکلی ہے جو ہر صاحبِ احساس کی دعا ہو سکتی ہے۔

خودی میں ڈوب زمانہ سے نا اُمید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے در پردہ اہتمامِ رفو

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روائت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(اقبال)

اسرارِ خودی

(اردو)

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(مولینا جلال الدین رومیؒ)

کل، شیخ چراغ لیے شہر کے گرد گھوم رہا تھا (اور کہتا تھا) "میں
وحشیوں اور درندوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے انسان کی آرزو ہے۔

ان تھکے ہارے ساتھیوں سے تو میرا دل اکتا گیا
مجھے شیرِ خدا اور رستمِ دستاں کی آرزو ہے
میں نے کہا وہ تو نہیں ملتا، ہم اسے تلاش کر چکے
اُس نے کہا۔ جو نہیں ملتا اسی کی تو مجھے آرزو ہے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرارِ خودی

تمہید

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم

(نظیری نیشاپوری)

لُٹ گئے جب لیلیِ شب کے گہر — میرے اشکوں سے ہوئے گُل خوب تر
میرے آنسو خوابِ نرگس لے اُڑے — جاگ اُٹھا سبزہ مری فریاد سے
میرے ہی زورِ سخن سے باغباں — بو کے مصرع لے سکا تیغِ زباں
باغ میں بس میرے آنسو بو دیئے — آہوں کے پیوند پودوں کو دیئے
ذرہ ہوں سورج میں ہے تابش مری — صبحیں رکھتا ہوں گریباں میں کئی

خاک میری رشکِ جامِ جم بھی ہے — ممکناتِ خلق کی محرم بھی ہے
صید میرے فکر نے وہ بھی کیا — آہوئے معنیٰ جو نازائیدہ تھا
نے اُگا سبزہ مرے گلشن میں ہے — پھول جو نکلا نہیں دامن میں ہے
میں نے بزمِ نغمہ کو برہم کیا — چھیڑ کر تارِ رگِ عالم ذرا
سازِ فطرت ہے مرا نادر نوا — دوست اس نغمے سے ہیں ناآشنا
میں جہاں میں مہرِ نوزائیدہ ہوں — رسم و آئینِ فلک نادیدہ ہوں
تارا میری تاب سے چمکا نہیں (۱) — بے قرار اب تک مرا پارا نہیں
بحر پر رقصِ ضیا میرا کہاں — کوہ پر رنگِ حنا میرا کہاں
میری خوگر کب ہے چشمِ ہست و بود — مجھ کو لرزا دیتا ہے خوفِ نمود
صبح میری ہو گئی اور شب کٹی — ہے گلِ عالم پر اب شبنم نئی
انتظارِ صبحِ خیزاں ہے مجھے — اب پجاری خوش ہوں میری آگ کے
بے نیازِ زخمہ اک نغمہ ہوں میں — ہاں نوائے شاعرِ فردا ہوں میں
ہے یہ دَور اسرار سے ناآشنا — میرا یوسف کب ہے اس بازار کا
کچھ نہ کر پائیں گے یارانِ قدیم — طُور ہے روشن مرا آئیں کلیم
مثلِ شبنم بحرِ یاراں بے خروش — میری شبنم ہے مگر طوفاں بدوش

میرے نغمے کا جہاں ہی اور ہے
اس جرس کا کارواں ہی اور ہے

اے بسا شاعر جو مر کر جی گئے
ق
زندہ ہم کو کر گئے خود چل بسے

پھر عدم سے مایۂ ہستی لیئے
اپنے مرقد سے مثالِ گُل اُگے

گزرے اس صحرا سے لاکھوں قافلے
چُپکے چُپکے راہ پر چلتے رہے

میں ہوں عاشق بندہ ہوں ایمان کا
شورِ محشر پیشِ خدمت ہے مرا

تار سے زائد ہے گو نغمہ مرا
ٹوٹے میرا ساز مجھ کو خوف کیا

قطرہ طوفاں سے مرے بیگانہ ہو
خوب لیکن بحر تو دیوانہ ہو

کیسے آئے میرا دریا نہر میں
میرے طوفاں کو سمندر چاہییں

جو کلی کھِل کر نہ گلشن بن سکی
مجھ سے نم یابی کے شایاں ہی نہ تھی

میری جاں میں بجلیاں ہیں محوِ خواب
کوہ صحرا میری جولانی کے باب

میرا دریا لے اگر صحرا ہے تو
برق مجھ سے لے اگر سینا ہے تو

دے دیا ہے چشمۂ حیواں مجھے
زندگی کے راز مجھ کو مل گئے

دیکھ اعجاز اس نوا کے سوز کا
ذرّہ ذرّہ جس سے جگنو بن گیا

راز جو کہتا ہوں وہ کس نے کہے
کس نے یوں موتی پروئے فکر کے

چاہتا ہے سرِّ عیشِ جاوداں
آ کے مجھ سے لے زمیں و آسماں

راز جو گردوں نے مجھ کو دیدیئے
ہیں چھپا سکتا نہیں احباب سے

ساقیا اٹھ جام کو صہبا سے بھر کاوشِ ایام دل سے دور کر
آبِ زمزم سے کھنچی مے چاہیے جو گدا کو ہمسرِ جم کر سکے
فکر جس سے ہو سکے ہشیار تر دیدۂ بیدار ہو بیدار تر
اعتبارِ کوہ دے جو کاہ کو شیر کی قوت دلِ روباہ کو
خاک کو اوجِ ثریّا دے سکے قطرے کو پہنائے دریا دے سکے
جس سے خاموشی میں شورِ حشر اٹھے ٹپکے خونِ باز پائے کبک سے
لا مجھے ساقی شرابِ ناب دے ظلمتِ اندیشہ کو مہتاب دے
سوئے منزل لے چلوں آوارہ کو مضطرب کر دوں دلِ نظارہ کو
جستجوئے نو سے ہو کر گرم رو روشناسِ آرزوئے نو بہ نو
بن سکوں میں نورِ چشمِ اہلِ ذوق گوشِ عالم کے لیے آوازِ شوق
اور سخن کی قدر بالا کر سکوں (۱) خشک سبزہ آنسوؤں سے تر کروں
پیش کرتا ہوں بہ فیضِ پیرِ روم آشکارا کر کے اسرارِ علوم
وہ گدازِ جاں کے ہیں سرمایہ دار ہیں فروغِ یک نفس مثلِ شرار
شمع ہی لپکی مرے پروانے پر مار اشب خوں مے نے اس پیمانے پر
خاک کو اکسیر رومیؒ نے کیا سوزِ میری گرد کو وہ دے دیا
ذرہ خاکِ دشت سے رخصت ہوا تا کہ حاملِ ہو شعاعِ مہر کا

اب میں اُن کے بحر کی اک موج ہوں ‏ ‏ سچا موتی تا کہ حاصل کر سکیں

ان کی صہبا سے ملی ہے سرخوشی

ہے انہیں کے دم سے میری زندگی

رات یہ دل مائلِ فریاد تھا ‏ ‏ شورِ "یارب" سے سکوت آباد تھا

شکوہ سنجِ سختیِ ایام تھا ‏ ‏ رونا بس یہ تھا کہ خالی جام تھا

اتنا تڑپا ذوقِ نظارہ مرا ‏ ‏ بال و پر توڑے تھکا اور سو گیا

خواب میں آیا وہ مردِ باخدا (۱) ‏ ‏ پہلوی میں جس نے قرآں ہے لکھا

بولا اے دیوانۂ اربابِ عشق ‏ ‏ چکھ لے تھوڑی سی شرابِ نابِ عشق

لے جگر پہ شورشِ محشر کا وار ‏ ‏ نیشتر پہ آنکھ شیشہ سر بہ بار

مسکراہٹ کو رہینِ نالہ کر ‏ ‏ اشکِ خونیں سے جگر پرکالہ کر

غنچہ ساں کب تک رہیگا تو خموش ‏ ‏ پھول کے مانند ہو نکہت فروش

تجھ میں تو ہنگامہ ہے مثلِ سپند ‏ ‏ باندھ محمل آگ پہ اے ارجمند

اور جرس کی طرح تو بھی سر بسر ‏ ‏ نالۂ خاموش کو آزاد کر

آگ ہے تو دے جہاں کو روشنی ‏ ‏ کر عطا دنیا کو اپنا سوز بھی

پیرِ میخانہ کے سب اسرار کہہ ‏ ‏ موجِ مے بن، جامۂ مینا میں رہ

سنگ بن آئینۂ اندیشہ توڑ — ہاں بھرے بازار میں یہ شیشہ توڑ

لا نیستاں سے پیام اب مثل نے (۱) — اور برائے قیس لا پیغام حے

نالہ کا اندازِ نو ایجاد کر — ہائے و ہو سے بزم کو آباد کر

جانِ تازہ کر عطا ہر زندہ کو (۲) — کہہ کے قُم اب زندہ تر کر زندہ کو

اٹھ نئے جادے پہ ہو محوِ سفر — سر سے سودائے کہن کو دور کر

آشنائے لذّتِ گفتار ہو — اے درائے کارواں بیدار ہو

میں یہ سُن کر شعلہ در دامن ہوا — مثلِ نے ہنگامہ سے بھرپور تھا

ساز سے اپنے اٹھا مثلِ نوا — بہرِ گوش اک خلد کا ساماں کیا

میں نے ظاہر کر دیا رازِ خودی
میں نے کھولا سرّ اعجازِ خودی

میرا نقشِ ہستی اک انگارہ تھا (۳) — ناقبول و ناکس و ناکارہ تھا

عشق کی سوہاں سے میں آدم ہوا — عالمِ کیف و کمِ عالم ہوا

حرکتِ اعصابِ گردوں دیکھ کر — چاند میں بھی گردشِ خوں دیکھ کر

راتوں انساں کے لیے رویا کیا — زندگی کا راز آخر پا لیا

کھولا بابِ کارگاہِ ممکنات — میں نے پایا رازِ تقویمِ حیات

مثلِ مہ اس شب میں حسن آرا ہوں میں
ملّتِ بیضا کی گردِ پا ہوں میں

شہرۂ آفاقِ ملّت ہے یہی
ہے دلوں کا سوز اس کی نغمگی

اس نے سورج ذرّے سے پیدا کیے
سینکڑوں عطّار و رومی بھر لیے

آہِ سوزاں ہوں فلک پر جاؤں گا
ہوں دھواں لیکن حقیقی آگ کا

فکرِ عالی سے قلم ہے تیز گام
رازِ نُہ افلاک کھلتے ہیں تمام

تاکہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے

ارتقا سے ذرہ بھی صحرا بنے

اس سخن سے شاعری مقصد نہیں
بُت پرستی بُت گری مقصد نہیں

میں ہوں ہندی فارسی بیگانہ ہوں
ماہِ نو ہوں اور تہی پیمانہ ہوں

حسنِ اندازِ بیاں مجھ سے نہ مانگ (۱) خوانسار و اصفہاں مجھ سے نہ مانگ

گرچہ شیرینی میں ہندی ہے شکر
فارسی ہے اس سے شیریں بیش تر

فکر پر جب اس کا جادو چل گیا
کلک میرا شاخِ نخلِ طور تھا

فارسی اس ذہن کی رفعت لیے
ہے مناسب میری طرزِ فکر کے

نکتہ چینی شکلِ مینا پر نہ کر

لطف صہبا سے اٹھا اے دیدہ ور

(۲)

اصلِ نظامِ عالم خودی سے ہے اور تسلسلِ حیاتِ تعیّناتِ وجود کا انحصار استحکامِ خودی پر ہے

بس خودی کا اک اثر ہے یہ شہود — اصلِ شے سرِّ خودی کی ہے نمود
جب خودی نے خود کو چونکا یا ذرا — عالمِ پندار ظاہر کر دیا
سو جہاں پنہاں ہیں اسکی ذات میں — اسکی ضد ہے اس کے ہی اثبات میں
اس نے یہ طرزِ جدل ایجاد کی — خود سمجھ بیٹھی ہے خود کو اجنبی
غیر پیدا کر کے خود سے بار بار — یہ بڑھا لیتی ہے ذوقِ گیر و دار
خون پھر کرتی ہے خود اغیار کا — تاکہ اپنے زور سے ہو آشنا
خود فریبی اس کی عینِ زندگی — مثلِ گُل خوں سے وضو کرتی ہوئی
روندتی ہے سو چمن گل کے لیے — برسوں روتی ہے کہ اک نغمہ ملے
اک فلک پر اس سے ہیں سو سو ہلال — کرتی ہے اک حرف پر صد ہا مقال
وجہ اس بے دردی اور اسراف کی؟ — "خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی"
"حسنِ شیریں عذرِ دردِ کوہ کن" — نافہ عذرِ دامِ آہوئے خُتن
سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہے — شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہے

سینکڑوں نقش "آج" کے اس نے بنائے — تاکہ "کل" کی صبح اس کے ہاتھ آئے
سو براہیم اس کے شعلوں نے جلائے — تاکہ اک شمعِ محمدؐ جگمگائے
ہوتی ہے یہ بہرِ اغراضِ عمل — عامل و معمول و اسباب و علل
"خیزد - انگیزد - پرد - تابد - رمد ⁘ سوزد - افروزد - کشد - میرد - دمد"
اس کی جولاں گاہ ہے دشتِ زماں — موجِ گردِ راہ ہے یہ آسماں
ہے یہی گل کارِ آفاق و جہات — جاگنے سے اس کے دن سونے سے رات
اپنے شعلے کو شرر ہیں بانٹ کے — جز پرستی کے سبق اس نے دیئے
ٹوٹی خود اجزائے بے ساماں بنائے — کچھ ذرا بکھری تو ریگستاں بنائے
پھر بکھرنے سے ہوئی بیزار جب — ملنے جلنے سے ہوئی کہسار تب
خود کو ظاہر کرتی ہے ہر دم خودی — ذرّوں میں خوابیدہ قوت ہے یہی

قوتِ خاموش و بے تابِ عمل
ہے عمل سے واقفِ اسبابِ عمل

جانِ عالم جب کہ ہے زورِ خودی — ہے بقدرِ استواری زندگی
قطرے نے سمجھا جہاں حرفِ خودی — ہستیِ بے مایہ گوہر بن گئی

⁘ اٹھتی ہے - اٹھاتی ہے - اڑتی ہے - چمکتی ہے - دوڑتی ہے
جلتی ہے - جلاتی ہے - مار ڈالتی ہے - مرتی ہے - اگتی ہے (سانس لیتی ہے -)

مے ہے بے پیکر خودی کے ضعف سے — اس کے پیکر پر ہیں احساں جام کے
پیکرِ ساغر نہیں گو مستعار — گردش اپنی ہم سے لیتا ہے اُدھار
کوہ جب خود سے گیا صحرا ہوا — شکوہ سنجِ جوششِ دریا ہوا
موج ہے جب تک بھی ہم آغوشِ بحر — کرتی ہے خود کو سوارِ دوشِ بحر
آنکھ کی پتلی بنا جب گھرِ کے نور — جلووں کے پیچھے نظر پہنچی ضرور
سبزہ نے زورِ نمو جب لے لیا — فرشِ گلشن میں شگاف آنے لگا
شمع خود زنجیر جب اپنی بنی — ذرّوں سے وہ اپنی صورت پا گئی
جان اس کی خود گدازی سے گئی — اشک اپنی آنکھ کا بن کر بہی
گر نگیں فطرت میں ہوتا پختہ تر — اس کو کیوں ہوتا جراحت کا خطر
ہو گیا سرمایہ دارِ نامِ غیر — اب ہے وہ مجروحِ بارِ نامِ غیر
اپنی ہستی پر زمیں محکم ہے جب — گرد اس کے گھومتا ہے چاند تب
مہر محکم تر زمیں سے ہے مگر — یوں زمیں سورج کے ہے زیرِ اثر
دم بخود کر دیتی ہے شانِ چنار — اس کی سطوت ہے متاعِ کوہسار
اس کا پیراہن جو ہے آتش نژاد — ایک سرکش دانہ ہے اس کی نہاد

ساتھ ہو جب زیست کے زورِ خودی
بحر بن جاتی ہے جوئے زندگی

(۳)

حیاتِ خودی تخلیق و تولیدِ مقاصد سے ہے

مدّعا سے ہے بقائے زندگی | یہ درا ہے کاروانِ زیست کی

زندگی بس جستجو میں ہے نہاں | اصل اس کی آرزو میں ہے نہاں

دل میں زندہ رکھ ہمیشہ آرزو | تا کہ جیتے جی بنے مرقد نہ تو

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو | ہے دلِ ہر شے امینِ آرزو

رقص گاہِ دل اسی سے سینے ہیں | سینے اس سے تابناک آئینے ہیں

بخشتی ہے خاک کو یہ بال و پر | موسیِ ادراک کو یہ ہے خضر

دل میں جاں آتی ہے اس کے سوز سے | غیر حق مرتا ہے جب یہ جی اٹھے

جب کہ تخلیقِ تمنّا گم ہوئی | پرِ شکستہ دل سے پرواز اڑ گئی

آرزو ہے شورش افزائے خودی | گرم رَو اک موجِ دریائے خودی

ہے یہی صیدِ مقاصد کی کمند | دفترِ افعال کی شیرازہ بند

زندہ نفیِ آرزو سے مُردہ ہے | شعلہ نفسِ سوز سے افسردہ ہے

اصل کیا ہے دیدۂ بیدار کی؟ | ایک صورت لذّتِ دیدار کی

(معجزے ہیں شوخیِ رفتار کے | پاؤں کبکِ ناتواں کو مل گئے

تھی یہ بلبل کی فقط سعیِ نوا | حاملِ منقار جس سے وہ ہوا)

نیستاں سے نے جو باہر آ بسی — اس کی نے آزاد اسی دم ہو گئی
عقل کی ندرت ہے کیا پرواز کیا — تو نہیں واقف یہ ہے اعجاز کیا؟
آرزو ہے بس متاعِ زندگی — عقل اس کے بطن سے پیدا ہوئی

کیا ہے نظمِ قوم و آئین و رسوم — کیا ہے رازِ تازگیہائے علوم
آرزو پھوٹی جب اپنے زور سے — دل سے نکلی سینکڑوں شکلیں لیے
دست و دنداں اور دماغ و چشم و گوش — فکر و تخییل اور شعور و یاد و ہوش
زندگی جب جنگ کے میداں میں آئی — ڈھال کے حربے یہ اپنے ساتھ لائی
علم و فن کب ہیں برائے آگہی — کب ہیں مقصودِ چمن پھول اور کلی
علم ہے سامانِ حفظِ زندگی — علم ہے اک وجہِ تقویمِ خودی
علم و فن ہیں پیش خیزانِ حیات — علم و فن ہیں خانہ زادانِ حیات
تو کہ ہے اس راز سے بیگانہ اٹھ — اٹھ مئے مقصد سے ہو مستانہ اٹھ
مقصد اک مثلِ سحر تابندہ ہو — ماسوا کو آتشِ سوزندہ ہو
ایسا مقصد جس سے ہو پست آسماں — دل پذیر و دل ربا و دل ستاں
باطلِ دیرینہ کا جو ہو عدو — فتنہ در دامن قیامت رو بہ رو

ہم ہیں تخلیقِ مقاصد سے ہے جاں
ہم ہیں نورِ آرزو سے ضو فشاں

(۴۳)

خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے

نور کا نقطہ جسے کہیے خودی
وہ ہماری خاک کی ہے زندگی

عشق سے ہوتا ہے وہ پایندہ تر
"زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر"

عشق سے جانِ خودی آتش بذات
ارتقا یاب اس کے مخفی ممکنات

آتش اندوز اس کی فطرت عشق سے
عالم افروز اس کی فطرت عشق سے

خوفِ خنجر عشق کو ہے ہی نہیں
آب و باد و خاک اصل اس کی نہیں

عشق خود ہے صلح بھی پیکار بھی
آبِ حیواں تیغِ جوہر دار بھی

ہوتے ہیں اس کی نظر سے کوہ شق
حق ہی بن جاتا ہے آخر عشقِ حق

عشق کر محبوب کوئی تو بنا
چشم نوح ایوب کا دل لے کے آ

خاک سے اپنی بنا لے کیمیا
جا کسی کامل سے جا کر دل لگا

تجھ میں سوزِ جانِ رومی چاہیے
پھونک دے روم آتشِ تبریز سے

تیرا پیارا تیرے دل میں ہی نہاں
تو اگر چاہے کروں تجھ پر عیاں

اس کے عاشق ہیں حسینوں کے حسیں
خوش ادا، محبوب تر او رمہ جبیں

اس کی الفت دل کی ہے تاب و تواں
خاک کو دیتی ہے اوجِ آسماں

جس سے خاکِ نجد تیراتی ہوئی — وجد میں افلاک سے اونچی گئی

قلبِ مسلم ہے مقامِ مصطفےٰ — آبرو مسلم کی نامِ مصطفےٰ

طُور کیا ہے ان کے گھر کی خاکِ در — کعبے کا بیت الحرم ہے ان کا گھر

اور ابد اک پل ہے ان کے وقت کا — ہے انہیں کے دم سے اس کا ارتقا

بسترِ خواب ان کا تھا اک بوریا — تاجِ کسریٰ قوم کے قدموں میں تھا

معتکف غارِ حرا میں جب رہے — قوم کو آئین و حکومت دے گئے

ان کی راتیں نیند سے عاری رہیں — تختِ جم پر سوئی تب اُمت کہیں

رن میں ان کی تیغ تھی آہن گداز — آنکھ نم رہتی تھی دورانِ نماز

فتح پیکر ناصرِ دیں ان کی تیغ — قاطعِ نسلِ سلاطیں ان کی تیغ

اک نیا آئین دنیا کو دیا — اقتدار اقوامِ پیشیں سے لیا

کام دنیا کا بنایا دین سے — غیر ممکن کوئی ان جیسا ملے

اونچ نیچ ان کی نظر میں تھی حرام — کھانا ان کے ساتھ کھاتے تھے غلام

سامنے آئی جو بعدِ دار و گیر — دخترِ سردارِ طے ہو کر اسیر

پانو میں زنجیر تھی بے پردہ تھی — شرم سے سمٹی ہوئی افسردہ تھی

آپ نے دیکھی جو یہ بے پردگی — اپنی چادر اس کے سر پہ ڈال دی

ہم تو عریاں تر ہیں اس خاتون سے　　پیشِ اقوامِ جہاں ہیں سر کھلے
حشر میں اُن پہ ہے اپنا انحصار　　اس جہاں میں بھی ہمی ہیں پردہ دار
ان کا لطف و قہر رحمت جانیے　　دوست پر وہ اور یہ دشمن کے لیے
مکّہ میں بورِ رحم اعدا پر کیا (۱)　　دے دیا پیغامِ "لا تثریب" کا
ہم کہ ہیں قیدِ وطن سے ایسے دُور　　اک نظر ہو جیسے دو آنکھوں کا نور
اہلِ ایران و حجاز و اہلِ چیں　　شبنمِ یک صبحِ خنداں ہیں ہمیں
مستِ چشمِ ساقیِ بطحا ہیں ہم　　دہر میں مثلِ مے و مینا ہیں ہم
ان کے سوزِ دل نے دنیا پاک کی　　انبیا زاتِ نسب کو آگ دی
(ایک بو جیسے گلِ صد برگ کی　　ہم بھی خوشبو رکھتے ہیں بس ایک ہی
جو بھی ہم ہیں اور جہاں بھی ہو قیام　　ایک ہیں وہ۔ ان سے ہو اپنا نظام)
ان کے دل کا راز تھے گویا ہمیں　　ان کے نعرے سے ہوئے افشا ہمیں
ان کی دُھن ہو اس نئے خاموش میں　　نغمے بیکل ہیں مری آغوش میں
کیا کہوں ان کی تولا کے لیے (۲)　　روئی چوبِ خشک ان سے چھوٹ کے
ہستیِ مسلم ہے ان کی جلوہ گاہ　　خالقِ صد طور ان کی گردِ راہ
مجھ کو صورت ان کے آئینے نے دی　　نور سے ان کے سحر میری ہوئی

ہے تپش میرے لیے راحت مدام گرم تر ہے صبحِ محشر سے یہ شام
ہیں ہیول ان کا باغ وہ ابرِ بہار میرے تاکِ نال کے وہ ہیں آبیار
کشتۂ الفت ہیں جب آنکھیں کاشت کیں دید کی تب لذتیں مجھ کو ملیں
خاکِ یثرب میں دو عالم کا ہے نور اے سلامت شہر جس میں ہیں حضورؐ
ہیں شہیدِ طرزِ جامیؒ ہو چکا نقص میرا قول سے ان کے مٹا
کیا کہا ہے شعر انھوں نے پُر اثر مدحِ مولا میں پروئے ہیں گہر

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست [1]

کیفیت انگیز ہے مے عشق کی عشق کا اک نام ہے تقلید بھی
اس میں بسطامیؒ تھے اتنے کامیاب (۲) کرتے تھے خربوزے سے وہ اجتناب
ہے اگر عاشق تو کر تقلیدِ یار تاکہ ہوں تیری کمندیں حق شکار
دل کی خلوت میں پہنچ اے دیدہ ور ترکِ خود کر سُوئے حق ہجرت تو کر
ہو کے محکم حق سے خود کی سمت چل اور ہوس کے توڑ دے لات و ہُبل
کر مہیا لشکرِ سلطانِ عشق جلوہ گر ہو جا سرِ فارانِ عشق

تاکہ ربِّ کعبہ تجھ کو اوج دے
شرحِ اِنّی جاعلٌ کر دے تجھے [3]

(۵)

خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے

اے کہ تو لیتا تھا شیروں سے خراج — بن گیا بزدل بوجہ احتیاج

خستہ اب یوں ہے کہ تو نادار ہے — تیرے دکھ کی جڑ یہی آزار ہے

ہے یہی بس رہزنِ فکرِ بلند — کر کے گل شمعِ خیالِ ارجمند

ہاں خُمِ ہستی سے مے کا جام لے — اپنا حق لے کیسۂ ایام سے

اونٹ سے نیچے اتر مثلِ عمرؓ — لہ غیر کی منت سے سو بار الحذر

سائلِ منصب رہے گا تا بہ کے — مثلِ طفلاں ہے سوارِ اسپِ نے

ہو نظر جس کی فرازِ چرخ پر — کرتا ہے پست اس کو احسانِ دگر

بھیک سے ہوتی ہے غربت خوار تر — اور گدائی سے گدا نادار تر

منتشر اس سے ہیں اجزائے خودی — "بے تجلّی نخلِ سینائے خودی"

اپنی مٹی منتشر ہونے نہ دے — ۲ مثلِ مہ خود ہی سے اپنا رزق لے

تو جو بدبختی کے ہو گرداب میں — ساز و ساماں ہو ترا اسباب میں

نعمتِ دیگر سے رزق اپنا نہ مانگ — چشمۂ خاور سے اک چھینٹا نہ مانگ

تاکہ محشر میں خجالت سے بچے — آئے جب اپنے نبی کے سامنے

چاند کی روزی ہے خوانِ مہر سے
دیکھ اس کے دل پہ داغِ احسان کے

حق کی ہمّت پر فلک کو آزما
سر نہ جھکنے پائے تیری قوم کا

جو بتوں سے پاک کعبہ کر گئے
"مردِ کاسب" حق کا پیارا کہہ چکے

وائے وہ منّت پذیرِ خوانِ غیر
جس کی گردن خم کرے احسانِ غیر

جلتا ہو جو برقِ لطفِ غیر سے
کوڑیوں میں رکھ دے غیرت بیچ کے

اس پریشاں تشنہ لب پر آفریں
خضر سے اک جام جو لیتا نہیں

اس کے رُخ پر خجلتِ سائل نہیں
آدمی وہ صرف مشتِ گِل نہیں

زیرِ گردوں بس وہی اک ارجمند
چلتا ہے مثلِ صنوبر سر بلند

مفلسی میں جو رہے خود دار تر
بخت سوئے اور وہ ہو بیدار تر

بھیک کا دریا ہے سیلِ شعلہ بار
اپنی محنت کی ہے شبنم پُر بہار

یوں حباب آسا دمِ مردانہ رکھ
بحر کے اندر رنگوں پیمانہ رکھ

(۶)

جب خودی عشق و محبّت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی تمام ظاہر و پنہاں قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

جب کہ محکم ہو محبّت سے خودی
بنتی ہے فرماں دہِ عالم وہی

نقش تاروں سے بنائے چرخ نے ‎ ‎ غنچے چُن کر بس خودی کی شاخ سے
ہاتھ بن جاتا ہے اس کا دستِ حق ‎ ‎ اک اشارے سے قمر ہوتا ہے شق
عالمی جھگڑوں میں وہ بن کر حَکَم ‎ ‎ ہوتی ہے فرماں دِہِ دارا و جم
تجھ سے کہتا ہوں حدیثِ بوعلیؒ ‎ ‎ اُن سے ہیں اس ملک میں واقف سبھی
"اُس نوا پیرائے گلزارِ کہُن ‎ (۱) ‎ گفت با ما از گلِ رعنا سخن"
اک دیارِ جنت آتش سرشت ‎ ‎ ان کے دامن کی ہوا سے ہے بہشت
کوچکِ ابدال ان کا راہ عام پر ‎ ‎ مست جامِ بوعلیؒ تھا سربسر
عاملِ شہر آیا گھوڑے پر سوار ‎ ‎ ساتھ تھے اس کے غلام و چوبدار
بڑھ کے چلّایا نقیب اے بے شعور ‎ ‎ راہِ ہمراہانِ عامل سے ہو دور
غرقِ فکر از بسکہ وہ درویش تھا ‎ ‎ سر جھکائے راہ پر چلتا رہا
چوبدار اتنا گھمنڈی تھا مگر ‎ ‎ لاٹھیاں ماریں سرِ درویش پر
ہٹ گیا لیکن فقیر آزردہ تھا ‎ ‎ دل شکستہ ناخوش و افسردہ تھا
آکے پیشِ بوعلیؒ فریاد کی ‎ ‎ اس قدر رویا کہ موجِ اشک اُٹھی
جس طرح کہسار پر بجلی گرے ‎ ‎ بول اٹھے شیخ آگ برسانے لگے
اک نیا شعلہ رگِ جاں سے اُٹھا ‎ ‎ میر منشی سے یہ فرمایا گیا

لکھا ابھی فوراً قلم سے کام لے — شاہ کو فرمان میرا بھیج دے

ظلم خود یہ تیرے عامل نے کیا — میرے دیوانے کو زخمی کر دیا

برطرف کر عامل بدذات کو — ورنہ میرے حکم سے معزول ہو

اس خدا والے کا یہ خط جب ملا — خوف سے سلطان تھرّانے لگا

سربسر اک پیکرِ آلام تھا — زرد مثلِ آفتابِ شام تھا

طوق ڈالا عاملِ مغرور کے — عفو چاہا بوعلیؒ درویش سے

خسروؒ شیریں سخن رنگیں بیاں — جن کے نغموں میں ہے روحِ کن فکاں

شاعرِ روشن ضمیر و با ادب — ہو گئے بہرِ سفارت منتخب

چنگ انھوں نے چھیڑا پیشِ بوعلیؒ — سوزشِ جانِ قلندر بڑھ گئی

شان وہ جو نازشِ کہسار تھی — قیمتِ یک نغمۂ گفتار تھی

دل پہ درویشوں کے نشتر مت چلا
آتشِ سوزاں میں خود کو مت جلا

---

(۷)

حکایت

اس معنی میں کہ مسئلۂ نفیِ خودی مغلوب قوموں کی اختراع ہے
جو اس مخفی طریقے سے غالب قوموں کے اخلاق کو
کمزور بنا دیتی ہیں

یہ پرانی داستاں بھی ہے سُنی | بھیڑیں اک میداں میں رہتی تھیں کبھی
گھاس وافر پا کے نسل افزا ہوئیں | دشمنوں کے خوف سے آزاد تھیں
قومیِ قسمت سے آخر ایک بار | ہو گیا تیرِ بلا سینے کے پار
شیر جنگل کی طرف سے آ گئے | اُس چراگہ پر بھی قبضہ پا گئے
جذبۂ استیلا ہے قوت کا شعار | فتح ہے قوت کا رازِ آشکار
طبلِ شاہی شیروں نے بجوا دیا | بھیڑوں کو محرومِ آزادی کیا
کام ہی شیروں کا ہے سیرِ شکار | بھیڑوں کے خوں سے رنگا وہ مرغزار
بھیڑ اک چالاک تھی فہمیدہ تھی | کہنہ سال اور گرگِ باراں دیدہ تھی
قوم کے حالات سے تھی دل فگار | شیروں کے جور و ستم کی تھی شکار
قومیِ قسمت کے گو شکوے کیے | کام پکے کر لیے تدبیر سے

ناتواں اپنی حفاظت کے لیے — عقل سے لاتا ہے حیلے مانگ کے
اور غلامی میں پئے دفعِ ضرر — ہوتی ہے تدبیر اکثر تیز تر
پختہ جب ہو لے جنونِ انتقام — فتنہ جوئی کرتی ہے عقلِ غلام
اس نے سوچا عقدہ ہے مشکل ضرور — اپنا بحرِ غم ہے بے ساحل ضرور
زور کر کے شیر سے چھٹتے نہیں — دستِ سیمیں پر ہے پنجہ آہنیں
یہ بھی ناممکن کہ سن کر وعظ و پند — خوئے گرگی سیکھ لیں یہ گوسفند
شیروں کو بزدل بنانا سہل ہے — ہاں انہیں غافل بنانا سہل ہے
صاحبِ الہام بس وہ ہو گئی — کچھ سمجھ کر شیروں کی واعظ بنی
اور کہا اے قومِ کذابِ اشر [1] — یومِ نحسِ مستمر سے بے خبر
مایہ دارِ قوتِ ایماں ہوں میں — بہرِ شیراں مرسلِ یزداں ہوں میں
دیدۂ بے نور کا میں نور ہوں — صاحبِ دستور ہوں مامور ہوں
چھوڑ دو اعمالِ نامحمود کو — نفع کی سوچو ضرر کے دوستو
جو قوی اور تند ہے وہ ہے شقی — زندگی کا زور ہے نفیِ خودی
گھاس ہی بس نیک بندوں کی غذا — گوشت کا تارک ہے مردِ باخدا
تیزیِ دنداں سے تم رسوا ہوئے — عقل کے اندھے اسی سے ہو گئے

ہے ضعیفوں کے لیے خلدِ بریں — فائدہ کچھ زور و قوت سے نہیں
جستجوئے عظمت و سطوت بُری — تنگ دستی ہے امیری سے بھلی
برقِ دشمن کب ہے دانے کی کہیں — دانہ جو خرمن بنے عاقل نہیں
کیوں بنو صحرا تم اک ذرّہ بنو — تاکہ سورج سے لیک لو نور کو
مار کر بھیڑیں جو تم کرتے ہو ناز — ذبح کر کے خود کو ہو نئے سرفراز
زندگی کو کرتا ہے ناپائیدار — "جبر و قہر و انتقام و اقتدار"
سبزہ دب دب کر اُگا ہے بار بار — خوابِ مرگ آنکھوں سے وہ دھوتا رہا
خود کو بھولو تم اگر فرزانے ہو — خود سے گر غافل نہیں دیوانے ہو
آنکھیں، لب اور کان کر لو خوب بند — تاکہ تم کو مل سکے فکرِ بلند
یہ چراگاہِ جہاں ہے چیز کیا — دل نہ اس موہوم پہ آئے ذرا
سخت کوشی سے تھکے تھے شیر سب — تن پرستی کی طرف مائل تھے اب
یہ سُہانا وعظ اُن کو بھا گیا — بس حماقت سے یہ دھوکا کھا لیا
وہ شکاری تھے جو اَب تک بھیڑ کے — گوسفندی دین پر عامل ہوئے
سبزہ آخر ان کے منہ کو لگ گیا — گوہرِ شیری خزف بن کر رہا،
گھاس سے وہ تیزیِ دنداں گئی — آنکھ کی ہیبت جو تھی جاتی رہی

رفتہ رفتہ دل بھی نکلا سینے سے　　تابِ جوہر گم ہوئی آئینے سے

وہ جنونِ کوششِ کامل گیا　　وہ تقاضائے عمل اور دل گیا

گم ہوا وہ عزم و استقلال بھی　　اعتبار و عزت و اقبال بھی

آہنیں پنجے بھی بے جاں ہو گئے　　مر گئے دل، تن مزار اُن کے بنے

خوفِ جاں بڑھنے لگا قوت گئی　　موت سے گھبرائے تو ہمت گئی

سو مرض دے کر گئی بے ہمتی　　"کم نہ دستی، بے دلی، دون فطرتی"

شیر بیدار اس فسوں سے سو گیا

اس نے تہذیب اپنی پستی کو کہا

---

(۸)

افلاطونِ یونانی جس کے تصوّرات سے تصوف اور ادبیاتِ اسلامیہ بہت متاثر ہوئے، مسلکِ گوسفندی پر عامل تھا اس کے تخیّلات سے دُور رہنا واجب ہے (٭)

پیرِ خلوت گیر افلاطوں حکیم   سر گروہِ گوسفندانِ قدیم
ظلمتِ معقول میں جو کھو گیا   وادیٔ موجود میں لغزیدہ تھا
تھا اسیر اس درجہ نامحسوس کا   اعتبارِ چشم و گوش اس کو نہ تھا
موت کو اس نے بتایا زندگی   شمع کے بجھنے میں دیکھی روشنی
وہ تخیّل پر ہمارے ہے سوار   اس کی مے سے اونگھتے ہیں ہوشیار

(٭) افسوس ہے کہ اس مسئلے کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے۔ فارابی نے "الجمع بین الرائین" میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔ ملّا ہادی سبزواری نے جو حال کے ایرانی حکما میں سے ہیں اپنی کتاب اسرار الحکم میں زیادہ تر افلاطون کا تتبع کیا ہے۔ عربی اور فارسی جاننے والے ناظرین ان کتب کی طرف توجہ کریں۔ انگریزی دانوں کو فلسفۂ مغرب کی کسی انگریزی تاریخ سے ان مسائل کی حقیقت مختصر طور پر معلوم ہو جائے گی۔ (اقبال)

یہ فٹ نوٹ مسئلہ اعیان کے سلسلے میں درج ہوا ہے لیکن چونکہ اس باب کے عنوان کی اساس بھی یہی مسئلہ ہے اس لیے یہاں درج کر دیا گیا ہے۔

گوسفند اک شکلِ آدم میں نہ تھا
صوفیوں پر حکم اس کا چل گیا

خود کو سمجھا رازدارِ آسماں
عالمِ اسباب کو وہم و گماں

کرتا تھا تحلیلِ اجزائے حیات
کاٹی شاخِ سروِ رعنائے حیات

نہ زیاں کو سود ہی کہتا رہا
بُود کو نابود ہی کہتا رہا

اونگھتی فطرت نے ڈھالا ایک خواب
اس کی چشمِ ہوش سے نکلا سراب

چونکہ ذوقِ جہد سے محروم تھا
اس لیے وارفتۂ معدوم تھا

منکرِ ہنگامۂ موجود تھا
خالقِ اعیانِ نامشہود تھا

زندہ جاں کو عالمِ امکاں ہے خوب
مردہ جاں کو عالمِ اعیاں ہے خوب

اس کا آہو جانے کیا لطفِ خرام
کبک پر اس کے ہوا چلنا حرام

اس کی شبنم میں نہیں ہے تابِ رم
اس کے طائر میں نہیں اُڑنے کا دم

اس کے دانے میں نہیں اُگنے کا ذوق
اور نہ پروانے کو ہے جلنے کا شوق

کرنا کیا راہب ہمارا بھاگ اٹھا
اس جہاں کی شورشوں سے ڈر گیا

شعلۂ افسردہ سے کرتا تھا پیار
وہ تھا افیونی جہاں کا دستکار

سوئے گردوں وہ نشیمن سے گیا
پھر نہ اپنے آشیاں تک آ سکا

ہے خیال اس کا خمِ گردوں میں گُم
کیا کہوں یہ دُرد ہے یا خشتِ خم

اس کی مے سے زہر قوموں کو ملا
سو گئیں ذوقِ عمل گم کر دیا

(۹)

حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ

آرزو سے گرم ہے خونِ بشر — آرزو سے ہے یہی مٹی شرر
زندگی کے جام میں اس سے ہے مے — وہ اسی سے چست اور جولاں بھی ہے
زندگی مضموں ہے بس تسخیر کا — آرزو افسوں ہے بس تسخیر کا
صید افگن زندگی، دامِ آرزو — حسن کو اُلفت کا پیغام آرزو
کیسے لاتی ہے تمنّا دم بدم — اس نوائے زندگی میں زیر و بم
جو بھی کچھ ہے خوب و زیبا و جمیل — وہ ہماری جستجو کی ہے دلیل
نقش تیرے دل پہ ہو کر مو بہ مو — تیرے دل کو دیتا ہے وہ آرزو
"حسن خلّاقِ بہارِ آرزو" — ہے وہی پروردگارِ آرزو
قلبِ شاعر ہے تجلّی زارِ حسن (۱) — اس کا سینا مطلعِ انوارِ حسن
خوب ہے اس کی نظر سے خوب تر — فطرت اُس کے سحر سے محبوب تر
اس کے دم سے ہے عنادل کی چہک — اس کے غازے سے رخِ گل پر دمک

آرزو کا سوز ہے پروانوں میں — رنگ اسی کا عشق کے افسانوں میں
بحر و بر سب اس کے آب و گِل میں ہیں — سو جہاں پوشیدہ اس کے دل میں ہیں
نادمیدہ لالے اس کے ذہن میں — ناشنیدہ نغمے نالے ذہن میں
فکر اس کا انجم و مہ کا ہم نشیں — بد سے ناواقف ہے وہ خوب آفریں
خضر ہے اور حاملِ آبِ حیات — جس کے اشکوں سے جواں ہے کائنات
ہم گراں سیر اور خام و سادہ ہیں — راہِ منزل ہی میں پا افتادہ ہیں
بلبل اس کا اس لیے ہے نغمہ ریز — چال سے اس کی نہ ہو ہم کو گریز
اور چلیں ہم سوئے فردوسِ حیات — حلقۂ کامل بنے قوسِ حیات
کارواں اس کی درا پر گام زن — ہوتے ہیں اس کی ندا پر گام زن
اور ہمارے باغ میں اس کی نسیم — آکے بن جاتی ہے پھولوں کی شمیم
اس کے جلووں سے خود افزا زیست ہے — خود حساب و ناشکیبا زیست ہے

دعوتِ فیض اس سے پلتے ہیں سبھی
سوز اپنا عام کرتا ہے وہی

وائے وہ اک قوم اجل سے بہرہ مند — جس کے شاعر کو نہ ہو جینا پسند
بد ہو جس کے آئینے میں خوش نگار — تیشہ جس کا ہو جگر کے آر پار

بوسہ جس کا چھینے گُل کی تازگی ۔۔۔ اور بلبل سے لگن پروازگی
جس کی افیوں سے ہے تجھ میں مُردنی ۔۔۔ جس کے مضموں کی ہے قیمت زندگی
چھین لے جو خوبیِ سروِ چمن ۔۔۔ باز سیکھے جس سے تیتر کا چلن
نیم ماہی نیم انساں ایک شے (٭) ۔۔۔ وہ کہ مانندِ بنات البحر ہے
ناخدا پر کر کے جادوئے نوا ۔۔۔ غرق کرتا ہے سفینے بارہا
اُس کے ان نغموں سے پا کر بے حسی ۔۔۔ موت میں تُو دیکھتا ہے زندگی
خواہشِ ہستی بہر دَم چھین کر ۔۔۔ چھینتا ہے تجھ سے وہ تیرا گہُر
دیتا ہے طرزِ زیاں ہر سُود کو ۔۔۔ کرتا ہے مذموم ہر محمود کو
بخش کر اندیشے تجھ کو بے محل ۔۔۔ چھین لیتا ہے ترا ذوقِ عمل
وہ مریض اس کے سخن سے ہم ہیں زرد ۔۔۔ اس کے دورِ جام سے محفل ہے سَرد
اس کے نیساں میں نہیں بجلی کی تاب ۔۔۔ اس کا گلشن رنگ اور بو کا سَراب
حُسن کو اس کے ہے سچائی سے عار ۔۔۔ اس کے دریا میں ہیں گوہر عیب دار
جاگے کیسے نیند کا وارفتہ ہے ۔۔۔ اس کے دم سے سوزِ دل یخ بستہ ہے

(٭) بنات البحر = بناتِ اُخیاں جنھیں انگریزی میں سائی رنز کہتے ہیں۔ ملاحوں کے توہمات کے رو سے ان کا آدھا جسم مچھلی کا ہوتا ہے اور آدھا انسان کا۔ جہازراں انکی خوش آوازی سے گمراہ ہو کر غرق ہو جاتے ہیں۔

زہر آمیز اس کی بانگِ نغمہ بار ناگنیں ہیں اس کے پھولوں میں ہزار

اس کی مینا سے حذر اور جام سے

الحذر اس کی مئے گُل فام سے

اے کہ تجھ میں لغزشِ پا آ گئی وہ صبوحی اس کی مینا سے ملی

اس کے نغموں سے ترا دل بجھ گیا زہرِ قاتل تو نے کانوں سے پیا

ہے عیاں پستی ترے انداز سے بے نوا ہیں تار تیرے ساز کے

تجھ کو تن آسانیوں سے کام ہے ننگِ اسلام آج تیرا نام ہے

باندھ سکتے ہیں رگِ گل سے تجھے خستہ ہو سکتا ہے بادِ صبح سے

عشق رسوا ہے تری فریاد سے بگڑا نقش اس کا ترے بہزاد سے

تیرے دُکھ سے اس کا چہرہ زرد ہے اس کی گرمی تیرے دم سے سرد ہے

خستہ جاں ہے خستہ جانی سے تری ناتواں ہے ناتوانی سے تری

گریۂ طفلانہ کا خوگر ہوا آہوں سے بھرپور اس کا گھر ہوا

بھیک میں ہے مست وہ میخانوں کی تاکتا ہے کھڑکیاں کاشانوں کی

ناخوش و افسردہ و آزردہ ہے پٹ چکا دربان سے اب مُردہ ہے

غم سے مثلِ بید تھرّانے لگا آسماں کے شکوے لب پر لا چکا

ضعف اس کا ہمدمِ دیرینہ ہے — وصف اس کا ابتذال و کینہ ہے
نا سزا مایوس اور ہے نامراد — پست ہے کم بخت وہ اور بدنہاد
نیند ہمسایہ کی بھی اُڑ کر رہی — جان تیری اس کے نالوں سے گئی

وائے سوزِ دل جو یوں ٹھنڈا ہوا
ابتدا حق جس کی، باطل انتہا

زیست کی قدروں سے اس کی جانچ کر — جیب میں نقدِ سخن ہے کچھ اگر
برق ہو جیسے گرج سے پیشتر — فکر بینا ہے عمل کی راہ پر
رجعت اب سوئے عرب درکار ہے — فکرِ نایاب اور نیک ادب درکار ہے
چمکے شامِ کُرد سے صبحِ حجاز — ہوں عرب کے حُسن سے راز و نیاز (*)

(*) شیخ حسام الحق ضیاء الدین کے مقولے اَمْسَیْتُ کُرْدًا وَاَصْبَحْتُ عَرَبِیًّا (میں نے شام کی کرد کی حیثیت سے اور صبح کی عرب کی حیثیت سے) کی طرف اشارہ ہے
(اقبال اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں)

کہا جاتا ہے کہ ایک جاہل کُرد چند طالب علموں کے پاس گیا اور ان سے تصوف کے اسرار و رموز سکھانے کی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا چھت سے رسی باندھ کر اُلٹے لٹک جاؤ اور لٹکے لٹکے جب تک ہو سکے یہ پڑھتے رہو۔ ساتھ ہی ساتھ اسے کچھ مہمل الفاظ بھی بتا دیئے۔ سادہ لوح کُرد نے ایسا ہی کیا۔ اللہ نے اس کے خلوص اور ایمان کا بدلہ دیا کہ اس پر اسرار و رموز آشکار کر دیئے۔ وہ ولی بن گیا اور الٰہیات کے گہرے مسائل پر گفتگو کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کہا کرتا تھا کہ شام کو تو میں کُرد تھا لیکن اگلی صبح عرب بن کر اُٹھا (نکلسن) —— کردستان عراق اور ایران سے ملحق علاقہ

گُلِ گلستانِ عجم سے چن لیے — نو بہارِ ہند و ایراں دیکھ کے
گرمیِ صحرا سے اب کچھ لطف لے — دورِ جامِ بادۂ خُنر چلے
سر چھپا اب اس کی گرم آغوش میں — تن کو اس کی لُوں کے جھونکے بھی ملیں
مدتوں ریشم میں تو غلطاں رہا — کُھردرے کھدر کا عادی ہو ذرا
رقص تیرا فرشِ گُل پر ہو چکا — مثلِ گُل شبنم سے منہ بھی دھو چکا
ریگِ سوزاں پر ذرا خود کو لِٹا — چشمۂ زمزم میں بھی غوطہ لگا
مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا بہ کے — گلستانوں میں نشیمن تا بہ کے

اے ہما سایہ میں تیرے ارجمند — آشیانہ ہو سرِ کوہِ بلند
آشیاں ہمسایہ برق و رعد کا — مسکنِ شہباز سے اونچا بنا

تا کہ ہو شایانِ پیکارِ حیات
تجھ کو گرما دے ذرا نارِ حیات

---

(۱۰)

تربیتِ خودی کے تین مرحلے ہیں پہلے کا نام اطاعت دوسرے کا ضبطِ نفس اور تیسرے مرحلے کا نام نیابتِ الٰہی ہے۔

مرحلۂ اوّل اطاعت

خدمت و محنت شتر کا ہے شعار
صبر و استقلال سے ہے اس کو پیار

چلتا ہے بس راہِ کم غوغا میں وہ
کارواں کی ناؤ ہے صحرا میں وہ

اس کا نقشِ پا نصیبِ دشت ہے
کم خور و کم خواب و محنت مست ہے

مست زیرِ بارِ محمل راہ میں
پا بہ جولاں سوئے منزل راہ میں

سرخوش اپنی مستیٔ رفتار سے
صبر آموز اپنے راکب کے لیے

فرض ادا کر تو بھی اور ہو کامیاب (۱)
لے فیضِ عندہٗ حسن المآب

بن اطاعت کوش اے غفلت شعار
جبر سے ہوتا ہے پیدا اختیار

اک اطاعت ہی سے ناکس کس ہوئے
دیکھ شعلے سرکشی سے خس ہوئے

گر تا ہے تسخیر جو افلاک کی
ہے کسی آئین کا پابند بھی

گل کے زنداں میں ہوا خوشبو بنی
قید سے ہی نافۂ آہو بنی

رکھتے ہیں تارے سوئے منزل قدم
سر کسی آئیں کے آگے کر کے خم

سبزہ اُگتا ہے نمو کے دین پر
ہوتا ہے پامال اس کو چھوڑ کر

سوزِ پیہم لالہ کا قانون ہے
جس کے باعث اس میں جوئے لالہ خون ہے

قطرے دریا، وصل کے آئین سے
ذرّے صحرا، وصل کے آئین سے

باطنِ ہر شے کی قوت ہے یہی
تو نے اس کو چھوڑ کر کیوں راہ لی

آج اے آزادِ دستورِ قدیم
بس پہن لے پھر وہی زنجیرِ سیم

سختیٔ آئیں کے قصّے مت سُنا
خود پہ قائم رکھ حدودِ مصطفےٰ

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس

نفس تیرا اک شترہے خود پرست
خودسرو خودرائے اور اپنے میں مست

مرد بن ہاتھوں میں اس کی باگ لے
تاکہ ریزہ ہے تو موتی بن سکے

جو کہ خود پر بھی نہ قابو پا سکا
ہو گیا پابند حکمِ غیر کا

خاک سے تعمیر جب تیری ہوئی
ڈر کے ساتھ الفت بھی کچھ گوندھی گئی

ڈر جہاں کا آخرت کا۔ جاں کا خوف
خوفِ عرش و فرش این و آں کا خوف

سیم و زر سے عشق اور حُبِّ وطن
رشتہ داروں کی محبت حُبِّ تن

آب و گِل کی نسل ہے تن پروری — کشتۂ فحشا و منکر ہے یہی
رکھتا ہے گر تو عصائے لا اِلٰہ — ہر طلسمِ خوف توڑ اور کر تباہ
حق ہی جس کے جسم کی جاں ہو گیا — سر نہ اس کا پیشِ باطل جھک سکا
ہو گیا دل اس کا اتنا بے ہراس — رعبِ غیر اللہ نہ آیا اس کے پاس
جو حدودِ "لا" میں آ کر بس گیا — بیوی اور بچوں کی بندش سے چھٹا
ماسویٰ سے کر کے وہ قطعِ نظر (۱) — رکھتا ہے خنجر پسر کے حلق پر
وہ اکیلا بھی ہے مثلِ اک فوج کے — جاں گراں ہوتی نہیں اس کے لیے
لا اِلٰہ ہے اک صدف موتی نماز — حجِّ اصغر ہے مسلماں کی نماز
ہاتھ میں مسلم کے خنجر ہے یہی (۲) — قاتلِ فحشا و منکر ہے یہی
روزہ کیا ہے؟ فتح بھوک اور پیاس پر — خیبرِ تن پروری کو توڑ کر
نورِ فطرت حج ہے مومن کے لیے — جس سے ہجرت کے سبق اس کو ملے
ہے اطاعت ہی سے جمعیت تری — ناظمِ افرادِ ملت ہے یہی
اور زکوٰۃ ارمانِ دولت کی فنا — کرتی ہے ہم کو مساوات آشنا
دل جو حتّٰی تُنفِقُوا سے ہو قوی (۳) — حُبِّ زر کھو کر وہ ہوتا ہے غنی
ان سبھی سے تیرا استحکام ہے — تیری قوت بس ترا اسلام ہے

یا قوی کے ورد سے ہو جا قوی
ہو سوار اشترِ خاکی ابھی

مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی

گر شتر باں ہے جہاں باں بھی ہے تو — مالکِ تاجِ سلیماںؑ بھی ہے تو
ہے جہاں جب تک جہاں آرا ہے تو (۱) — تاجدارِ ملکِ لا یبلیٰ ہے تو
دہر میں حق کی نیابت کر پسند — اور عناصر پر حکومت کر پسند
نائبِ حق کیا ہے؟ جانِ کائنات — اسمِ اعظم کا ہے سایہ اس کی ذات
جزو و کُل کے راز سے آگاہ ہو — جو یہاں قائم بامر اللہ ہو
جب توجہ جانبِ عالم کرے — اس بساطِ کہنہ کو برہم کرے
فطرتِ معمور ہے تابِ نمود — اک نئے عالم کو جو بخشے وجود
سو جہاں مثلِ جہانِ جزو و کُل — ذہن سے اس کے اُگیں مانندِ گُل
پختہ کر کے فطرتِ ہر خام کو — کعبے سے باہر کرے اصنام کو
زخمہ اس کا تارِ دل پر نغمہ زا — بہرِ حق ہو اس کا سونا جاگنا
جس سے ہو پیری میں آہنگِ شباب — بخش دے ہر چیز کو رنگِ شباب

وہ بشیرِ نوعِ انساں وہ نذیر (۱) خود سپاہی خود سپہگر خود امیر
مدعائے عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ بھی ہے (۲) سرِ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بھی ہے
ہاتھ میں رکھتا ہے وہ زورِ عصا (۳) قدرتِ کامل سے رشتہ علم کا۔

باگ اُٹھا لیتا ہے جب وہ شہسوار
تیز ہوتا ہے سمندِ روزگار
خشک کر کے دبدبے سے نیل کو
مصر سے لاتا ہے اسرائیل کو
مُردہ روحیں مقبروں میں جسم کے (۴) زندہ ہو جاتی ہیں اس کے حکم سے
وجہِ ذاتِ عالم اک اس کا جمال
اور عالم کی نجات اس کا جلال
ذرّہ اس کے سایہ سے مہر آشنا
اعتبار اس سے ہے قدرِ زیست کا
زندگی بخش اس کا اعجازِ عمل
کرتا ہے تجدیدِ اندازِ عمل،
جلوے اس کے نقش پا سے آشکار
طور پر سو سو کلیم اس کے نثار
ہے اسی سے زیست کی تفسیرِ نو
دیتا ہے اس خواب کو تعبیرِ نو
ہستیِ مکنوں ہے اک رازِ زیست
ناشنیدہ اک نوائے سازِ زیست
طبعِ مضموں بندِ فطرت خوں ہے جب
شعر اس کی ذات کا موزوں ہو تب
ہے ہماری خاک کی منزل فلک
دیکھیں گے اس گرد میں اس کی جھلک
راکھ ہی میں ہے ہمارے آج، کی
'کل' کی عالم سوز روشن آگ بھی

بس ہمارا غنچہ ہے گلشن لیے   آنکھ یہ روشن ہے گل کے نور سے
اے سوارِ اشہبِ دوراں اب، آ   اے فروغِ دیدۂ امکاں اب آ
رونقِ ہنگامۂ ایجاد ہو   آ، ہماری آنکھوں میں آباد ہو
شورشِ اقوام کو خاموش کر   نغمہ اپنا اب بہشتِ گوش کر
اُٹھ کے قانونِ اخوّت ساز دے   پھر ہمیں صہبائے اُلفت چاہیے
پھر جہاں کو بخش دے ایّامِ صلح   جنگ بازوں کو سُنا پیغامِ صلح
نوعِ انساں کشت اور حاصل ہے تو   کاروانِ زیست کی منزل ہے تو
گر گئے جورِ خزاں سے برگ و بار   آ ہمارے باغ میں مثلِ بہار
دیکھ لے طفل و جوان و پیر سب   شرمساری سے ہیں سجدہ ریز اب

تیری ہستی سے جو ہم ہیں سرفراز
سوز اس دنیا کا ہے اپنا گداز

شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ (۱)

"مسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ" — عشق کا سرمایۂ ایماں علیؓ

ان کے کنبے کی ولا سے زندہ ہوں — دہر میں مثلِ گہر تابندہ ہوں

مثلِ نرگس ہیں نظارے کی لگی — بوئے آوارہ ہوں اُن کے باغ کی

اُن سے میری خاک میں زمزم کا جوش — میرے انگور ان کے دم سے میفروش

اُن کی ضَو سے آئینہ ہے میری خاک — دیکھ میرے سینے میں نغماتِ پاک

ان کے رخ سے ہی نبی نے فال لی — شان و شوکت ان سے ملّت کو ملی

قوتِ دینِ مبیں ہے ان کی بات — ان کے کنبے سے ہے نظمِ کائنات

نام پیغمبرؐ نے رکھا بوتراب — اور یداللہ کہتی ہے اُمّ الکتاب

جو ہے دانائے رموزِ زندگی — جانتا ہے سرِّ اسمائے علیؓ

"تن" ہے جس کا نام وہ بے نور خاک — عقل جس کے ظلم سے ہے سینہ چاک

پست جس سے فکرِ عالی ہو گئی — کان بہرے آنکھ نابینا ہوئی

یہ ہے شمشیرِ ہوس تو لے ہوئے — راہی اس رہزن پر آخر مر مٹے

شیرِ حق نے خاک یہ تسخیر کی — یہ گلِ تاریک بھی اکسیر کی

حق میں ان کی تیغ سے ہے آب و تاب — فتحِ ملکِ "تن" سے وہ ہیں بوتراب

مردِ کشور گیر کرّاری سے ہے — آن اس میں صرف خودداری سے ہے

ہو نکلے ہے آفاق میں جو بوتراب (۱) لوٹتا ہے اس کی خاطر آفتاب

تن پہ اپنے جو بھی قابو پا گیا — وہ نگینِ خاتمِ دولت بنا

فاتحِ خیبر ہے دنیا میں وہی — ساقیِ کوثر ہے عقبیٰ میں وہی

وہ خود آگاہی سے ہے دستِ خدا — اور یداللّٰہی سے ہے فرماں روا

ہے وہی دروازۂ شہرِ علوم — زیرِ فرماں اس کے نجد، چین و روم

حکمراں ہو تو بھی اپنی خاک پر — اپنے انگوروں کی مے سے شغل کر

خاک ہونا مذہبِ پروانگی — "بوترابیت" میں ہے مردانگی

سنگ بن اے مثلِ گل نازک بدن — تاکہ ہو بنیادِ دیوارِ چمن

اپنی مٹّی سے تو اک آدم بنا — اور اس آدم سے اک عالم بنا

تو بنا پایا نہ گر دیوار و در — غیر اس مٹّی سے بنوائیں گے گھر

اے کہ جورِ چرخ سے ہے آج تنگ — جام تیرا شاکیِ بیدادِ سنگ

آہ و زاری اور ماتم تا بہ کے — سینہ کوبی ہائے پیہم تا بہ کے

بس عمل ہی میں ہے مضمونِ حیات — "لذتِ تخلیق قانونِ حیات"

اٹھ کے خلاقِ جہانِ تازہ ہو — شعلہ در دامنِ خلیل آوازہ ہو

ہے جہاں دشمن تو اس سے ساز کیوں — تو ہو میداں میں سپر انداز کیوں

مردِ خوددار اور جو ہے پختہ کار — اس کا ساتھی ہے مزاجِ روزگار

سازگار اس کو نہ ہو گر یہ جہاں — ہوتا ہے تب وہ حریفِ آسماں

کرتا ہے تبدیل موجودات کو — دیتا ہے ترکیبِ نو ذرات کو

گردشِ ایام پلٹاتا ہے وہ — چرخِ نیلی فام ٹھہراتا ہے وہ

اپنے دم سے کرتا ہے وہ آشکار — عہدِ نو جو اس سے ہوگا سازگار

شانِ مردانہ نہیں گر زیست کی — مرنا، مُردوں کی طرح ہے زندگی

جانچتا ہے صاحبِ قلبِ سلیم — اپنا دم پیشِ مہماتِ عظیم

مشکلوں سے عشق کرنا چاہیے — پھول چُن مثلِ خلیل اس آگ سے

ممکناتِ زورِ مردِ کارداں — ہوتے ہیں مشکل پسندی سے عیاں

بزدلوں کا حربہ بیزاری ہے بس — زیست کا آئین یہ جاری ہے بس

زندگانی قوتِ پیدا ہے صرف — اصل اس کی ذوقِ استیلا ہے صرف

ضعف اس کا کیا ہے؟ عفوِ ناروا — سکتہ ہے یہ زندگی کے شعر کا

جو بھی ذلت کے گڑھے میں پس گیا — ناتوانی کو قناعت کہہ اٹھا

زندگی سے یہ چرا لیتی ہے دم ‏ جھوٹ اور ڈر کو بھی دیتی ہے جنم
ناتوانی میں نہیں خوبی کوئی ‏ دودھ پر پلتی ہے اس کے ہر بدی
ہوشیار اے صاحبِ عقلِ سلیم ‏ گھات میں بیٹھا ہوا ہے یہ غنیم
دھوکا مت کھانا اگر ہوشیار ہے ‏ یہ بھی گرگٹ کی طرح مکار ہے
اس کو پہچانے نہ اکثر دیدہ ور ‏ پردے ڈالے اس کے روئے نحس پر
رحم و نرمی اس کے پردے بن گئے ‏ انکسار اک آڑ ہے اس کے لیئے
گاہ پنہاں شکلِ مجبوری میں ہے ‏ اور کبھی پوشیدہ معذوری میں ہے
رخ تن آسانی اسی کا ہو گیا ‏ صاحبِ قوت کا دل اس نے لیا
زور سچ کے ساتھ لیتا ہے جنم ‏ تو ہے خود آگہ تو یہ ہے جامِ جم
زندگی کھیتی ہے حاصل زور ہے ‏ شرحِ رمزِ حق و باطل زور ہے
مدعی قوت سے گر ہے خود کفیل ‏ اس کا دعویٰ آپ ہے اپنی دلیل
آتی ہے باطل میں اس سے شانِ حق ‏ خود کو حق کہہ اٹھتا ہے بطلانِ حق
اس کا "کُن" زہراب کو کوثر بنائے (۱) ‏ خیر کو گر شر کہے تو شر بنائے
تو کہ آدابِ امانت سے ہے دور ‏ دونوں عالم سے ہے بہتر کر شعور
ہو رموزِ زندگی سے باخبر ‏ بے دھڑک بس ظلم غیر اللہ پر کر

بن کے مختارِ حواس اب زندہ رہ
پھر اگر بھٹکے مجھے دیوانہ کہہ

(۱۲)

حکایت

مَروؔ کا ایک نوجوان حضرت سید مخدوم علی ہجویری کی خدمت میں آیا اور دشمنوں کے ظلم کا شکوہ کیا۔

(۱) سیّدِ ہجویر مخدومِ اُمم — خواجۂ جن کی قبر کو سمجھے حرم
توڑ کر سب بندہائے کہسار — ہند میں لائے جو سجدوں کی بہار
(۲) عہدِ فاروقؓ ان سے تازہ ہو گیا — حق کا ان کی بات سے شہرہ ہوا
پاسبانِ عزتِ اُمّ الکتاب — تھا انہیں سے خانۂ باطل خراب
خاکِ پنجاب ان کے دم سے جی گئی — ان کے سورج سے سحر ہم کو ملی
عاشق اور خود قاصدِ طیّارِ عشق — سر بسر اک مظہرِ اسرارِ عشق
کرتا ہوں اب اک کمال ان کا بیاں — غنچے میں کرتا ہوں مضمر گلستاں
نوجواں قامت کشیدہ مثلِ سرد — آیا تھا لاہور میں اک مردِ مروؔ
پہنچا پیشِ سیّدِ والا جناب — تاکہ ظلمت دور کر دے آفتاب

بولا محصورِ صفِ اعدا ہوں میں　　پتھروں کی زد میں اک مینا ہوں میں

کیجیے تعلیم اے گردوں مکاں　　زندہ رہنا دشمنوں کے درمیاں

پیرِ دانا جن کی ہستی میں جمال　　تھا اسیرِ رشتۂ مہر و جلال

بولے اے نامحرمِ رازِ حیات　　جان لے انجام و آغازِ حیات

چھوڑ دے اندیشۂ اغیار کو　　قوتِ خوابیدہ ہے بیدار ہو

شیشہ جو بھی خود کو جانا سنگ نے　　شیشہ بن کر اپنے ٹکڑے کر لیے

خود کو جب کمزور سمجھا راہرو　　دے گیا وہ نقدِ جاں قزاق کو

آب و گل سمجھے گا خود کو تا کجا　　شعلۂ طور اپنی مٹی سے اٹھا

تو قوی ہے سرگراں ہوتا ہے کیوں　　شکوۂ سنگِ دشمناں ہوتا ہے کیوں

سچ یہ ہے دشمن بھی تیرا یار ہے　　گرم اس سے ہی ترا بازار ہے

ہے خودی کی شان جس پر آشکار　　کہتا ہے دشمن کو فضلِ کردگار

کشتِ انساں پر وہی ہے ابر بھی　　ممکنات اس کے جگاتا ہے وہی

سنگِ رہ پانی ہے ہمت چاہیے　　سیل کب رکتی ہے سدِّ راہ سے

راہ کا پتھر! فسانِ تیغِ عزم　　قطعِ منزل! امتحانِ تیغِ عزم

مثلِ حیواں کھانا اور پینا ہی کیا　　گر بخود محکم نہیں جینا ہی کیا

تجھ کو گر محکم کرے زورِ خودی | لوٹ دے چاہے تو دنیا آج ہی
مرنا ہے تو خود سے جا آزاد ہو | جینا ہے تو خود میں ہی آباد ہو
موت کیا ہے؟ از خودی غافل شدن | تو نے کیا سمجھا؟ فراقِ جان و تن!
گر خودی میں صورتِ یوسف مقام | تخت تک زنداں سے ہو محوِ خرام
بس خودی کی سوچ مردِ کار بن | مردِ حق بن حاملِ اسرار بن
قصوں میں اپنا راز افشا کیوں نہ ہو | زورِ دم سے غنچہ بھی وا کیوں نہ ہو

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

حکایت

اُس چڑیا کی جو پیاس سے بے تاب تھی

ایک چڑیا پیاس سے تھی ناتواں | دم تھا اس کے سینے میں جیسے دھواں
باغ میں ہیرے کا ٹکڑا دیکھ کر | قطرۂ آب اس کو سمجھی خیرہ سر
تھا فریب ریزۂ خورشید تاب | وہ حماقت سے جسے سمجھی تھی آب

آبِ گوہر میں کہاں ملتی نمی　　پیاس اس کو پا کے بھی باقی رہی
بولا ہیرا اے گرفتارِ ہوس　　تیز مجھ پر کی ہے منقارِ ہوس
دیکھ میں ساقی نہیں قطرہ نہیں　　میں کسی کے واسطے جیتا نہیں
مجھ کو کیا توڑے گی تو اے خیرہ سر　　اے حیاتِ خود نما سے بے خبر
باز کی منقار مجھ پر ٹوٹ جائے　　چاٹ لے گر آدمی دم چھوٹ جائے
مدّعائے دل نہ چڑیا کو ملا　　ہیرا اس کو چھوڑنا ہی پڑ گیا
حسرت اس کے دل میں گویا ایسی　　اب نوا کیا تھی بس اک فریاد تھی
شاخِ گل پر قطرۂ شبنم بھی تھا　　مثلِ اشکِ چشمِ بلبل رو نما
تاب کرنوں کے لیے مجھِ پیاس　　لرزہ تن میں دل میں سورج سے ہراس
ایک گرد دل نادہ وہ بے چین سا　　خود نمائی کو تھا دم بھر رک گیا
غنچۂ گل سے جو دھوکے کھا گیا　　زندگی سے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا
مثلِ اشکِ عاشقِ دلدادہ تھا　　زیبِ مژگاں گرنے پر آمادہ تھا
پیاسی چڑیا زیرِ شاخِ گل گئی　　بوندِ شبنم کی دہن میں آ گری
چاہتا ہے دشمنوں سے گر مفر　　پوچھتا ہوں کیا ہے؟ قطرہ یا گہر؟
پیاس کی گرمی سے جب چڑیا جلی　　دوسرے کی زندگی اپنا گئی

سخت گوہر کی طرح قطرہ نہ تھا
ہیرا باقی رہ گیا وہ چل بسا

ہو نگہبانِ خودی اے جانِ من
ریزۂ الماس بن شبنم نہ بن

پختہ فطرت صورتِ کہسار ہو
حاملِ صد ابرِ دریا بار ہو

خود کو پہچان اپنے ہی ایجاب سے
چاندی بن جا اپنے ہی سیماب سے

نغمہ زا ہو چھیڑ کر تارِ خودی
آشکارا کر دے اسرارِ خودی

ہیرے اور کوئلے کی کہانی

کرتا ہوں ظاہر حقیقت اک نئی
اب سناتا ہوں کہانی دوسری

کان میں ہیرے سے بولا کوئلہ
تو امیں ہے لازوالِ انوار کا

ہم ہیں ہمدم ایک سی ہے ہست و بود
ایک سا ہے دراصل دونوں کا وجود

میں یہاں مرتا ہوں ٹھکرایا ہوا
تاجِ شاہی سے ترا رشتہ ہوا

قدر میں بہتر ہے مجھ سے گردِ خاک
حُسن سے تیرے دلِ آئینہ چاک

نورِ آتش داں ہیں میرے خال و خد
راکھ تک ہے بس مرے جوہر کی حد

مجھ کو پامالی نصیبوں سے ملی
میری ہستی کو سبھی نے آگ دی

اس سر و ساماں پہ رونا چاہیے
کیا ہیں اس ہستی کے اجزا جان لے

میں دھواں ہوں ایک پیوستہ غبار
میری دولت ہے فروغِ یک شرار

تو بہ اندازہ تارا بن گیا
ہیں ہر اک پہلو سے جلوے رونما

گاہ نورِ دیدۂ قیصر ہے تو
گاہ زیبِ دستۂ خنجر ہے تو

بولا ہیرا۔ اے رفیقِ نکتہ بیں
پختہ ہو کر راکھ بنتی ہے نگیں

ہوتی ہے حالات سے جب اسکی جنگ
سخت ہو جاتی ہے وہ مانندِ سنگ

پختہ ہو کر تن مرا روشن ہوا
میرا سینہ جلوؤں کا مخزن ہوا

خوار ہے تو اس وجودِ خام سے
جل رہا ہے نرمیِ اندام سے

چھوڑ دے خوف و غم و وسواس کو
پختہ مثلِ سنگ ہو الماس ہو

ہوتے ہیں اس سے دو عالم مستنیر
جو یہاں ہو سخت کوش و سخت گیر

سنگِ اسود بھی بنا ہے خاک سے
رونما جو ہے حرم کے چاک سے

رتبہ اس کا طور سے برتر ہے اب
بوسہ گاہِ اسود و احمر ہے اب

ہے صلابت آبروئے زندگی
ناتوانی کیا ہے؟ خامی ناکسی

۱۳

حکایتِ شیخ و برہمن اور مکالمۂ گنگا و ہمالہ

اس معنے میں کہ روایاتِ مخصوصۂ ملّیہ پر گرفت مضبوط رکھنے سے حیاتِ ملّیہ کا تسلسل برقرار رہتا ہے

برہمن کاشی میں تھا اک محترم — تھا وہ غوّاصِ یمِ بود و عدم

فلسفے سے خوب نسبت تھی اسے — حق پرستوں سے ارادت تھی اسے

ذہن ندرت کوش تھا گیرا بھی تھا — عقل تھی بامِ ثریا تک رسا

تھے خیالات اس کے نادر اور بلند — فکر کے شعلے پہ مہر و مہ سپند

خوں سے گو مینائے دل رنگین ہوئی — دورِ حکمت کی رہی ساقی گری

جال باغِ علم میں اس نے بچھائے — طائرِ معنے نہ لیکن ہاتھ آئے

فکر کے ناخن سے خوں اسکے بہا — عقدۂ بود و عدم الجھا رہا

آہ برلب مظہرِ حرماں ہوا — چہرہ غمّازِ دلِ حیراں ہوا

ایک دن اک شیخ کامل سے ملا — جس کے سینے میں تھا دل انسان کا

بات اس نے شیخ کی سن لی سبھی — اور لبوں پر مہرِ خاموشی رکھی

بولا شیخ، اے طائفِ اوجِ سما خاک سے عہدِ وفا کر لے ذرا
چونکہ تیرا فکر ہے گردوں نورد اس لیے اب تو ہے اور صحرا کی گرد
کچھ تو نسبت اس زمیں سے بھی رہے جستجو ہی کیوں ستاروں کی رہے
میں نہیں کہتا صنم بیزار ہو کفر تو شائستۂ زنّار ہو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن" دیکھ! مت ٹھکرا بزرگوں کا چلن
ہے اگر ملّت میں جمعیت سے جاں کفر بھی ہے اس کی اک قدرِ گراں
کافری میں بھی جو تو کامل نہیں لائقِ طوفِ حریمِ دل نہیں
دونوں سے ہے جادۂ تسلیم دُور تجھ سے آذر مجھ سے ابراہیم دُور
اپنا مجنوں عاشقِ محمل نہیں وہ جنونِ عشق میں کامل نہیں

دل سے جب نورِ خودی جاتا رہا
ان فلک پیمائیوں سے فائدہ ؟

دامنِ کوہِ ہمالہ تھام کر رودِ گنگا نے کہا اے نامور
تو ازل کی صبح سے ہے یخ بدوش جسم دریاؤں سے ہے زنّار پوش
گرچہ فیضِ حق سے یہ رفعت ملی طاقتِ رفتار لیکن چھن گئی
جبکہ تجھ میں دم نہیں رفتار کا رفعت و تمکین سے کیا ہے فائدہ؟

وجہ ہستی ہے خرام پے بہ پے | زندگی تو موج کی بہنے سے ہے
کوہ نے دریا سے جب طعنہ سُنا | ایسا بھڑا بحرِ آتش ہو گیا
بولا۔ سُن لے تو ہے مشاطہ مری | تجھ سی ندیاں پالتا ہوں میں کئی
یہ ترا چلنا ہے سامانِ فنا | خود سے جو گزرا ہے شایانِ فنا
کیا ہے تو۔ اس کی نہیں تجھ کو خبر | ناز کرتی پھرتی ہے نقصان پر
خود سمندر کے حوالے ہو گئی | نقدِ جاں رہزن کے آگے رکھ چلی
گلستاں میں مثلِ گُل ہو خود شناس | بہرِ نشرِ بُو نہ جا گلچیں کے پاس
زیست ہے اپنی جگہ بالیدگی | اور چُھپتے رہنا کھلائے خودی
میں اٹل کل بھی تھا اور ہوں آج بھی | تو یہ سمجھی دور ہے منزل مری
میں ہوا بالیدہ اونچا اُٹھ گیا | میرا دامن بسترِ پرویں ہوا
ہے سمندر میں تری ہستی تباہ | میری چوٹی مہر و مہ کی سجدہ گاہ
دیکھتی ہے آنکھ اسرارِ فلک | سنتا ہوں آوازِ پروازِ مَلک
جل چکا جب سوزِ سعی و جہد سے | تب کہیں لعل و گہر مجھ کو ملے
در درونم سنگ و اندر سنگ نار (*) | آب را بر نارِ من نبود گزار

(*) مولانا روم بتغیرِ الفاظ — مجھ میں پتھر اور پتھر میں آگ ہے + میری آگ پر پانی کا گزر ممکن نہیں

قطرہ ہے تو خود کو نیچے مت گرا　　لڑ سمندر سے بھر کر اٹھ ذرا
آب گوہر لے کے گوہر ریزہ بن　　بہر گوش حسن اک آویزہ بن
یا خود افزا ابن سبک رفتار بن　　ابر برق انداز و دریا بار بن
بحر طوفانوں کی تجھ سے بھیک لے　　شکوہ سنجِ تشنگیِ داماں رہے

خود کو وہ موجوں سے کم تر جان لے
تیرے قدموں میں پڑا بہتا رہے

(۴۱)

مسلمان کی حیات کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور وہ جہاد جس کی محرک ہوسِ ملک گیری ہو مذہب اسلام میں حرام ہے

رنگ سے اللہ کے دل رنگ لے　　عشق کو ناموس و نام و ننگ دے
عشق ہو مسلم میں تو قاہر ہے وہ　　ہو نہ گر عاشق تو اک کافر ہے وہ
تابعِ حق رکھتا ہے وہ چشم و گوش　　خواب و بیداری اور اپنا خور و نوش
مرضیِ حق اس کی مرضی میں سمائے　　قول یہ لوگوں کو باور کیسے آئے
حق کا میداں ہے اسی کی خیمہ گاہ　　نوعِ انساں پہ وہی ہے بس گواہ
ہیں گواہ اس کے نبیِ انس و جاں　　شاہد اک صادق ترینِ شاہداں

قال چھوڑ اور روشناس حال ہو — کر منور ظلمتِ اعمال کو

شانِ درویشی ہے کشور دار بن — مردِ حق آگاہ و واقف کار بن

ہر عمل ہو بہرِ حق اے خوش خصال — تاکہ ہو تجھ سے عیاں حق کا جلال

صلح شر ہے مدعا ہو جس کا غیر — مدعا اللہ ہو تو جنگ خیر

ہو نہ جس سے حق کی عظمت آشکار — قوم کو وہ جنگ کر دیتی ہے خوار

"حضرت شیخ میاں میر ولی" — ہر خفی ہے نور سے جن کے جلی

تھا طریقِ مصطفےٰ ان کا شعار — عشق و الفت کے تھے سازِ نغمہ بار

مرکزِ ایماں ہے میرے شہر کا ؎ — ان کا مرقد مشعلِ نورِ ہدیٰ

ان کے در کو چومتا ہے آسماں — تھا مرید اُن کا شہِ ہندوستاں

وہ کمندِ حرص میں جب آ گیا — مُلک گیری کا ارادہ کر لیا

اور ہوس کی آگ تھی اتنی شدید — تھا زبانِ تیغ پر ھَل مِن مَزید

تب دکن میں شورشِ بسیار تھی — فوجِ شہ مصروفِ گیر و دار تھی

شاہ پہنچا آستانِ شیخ پر — تاکہ مل جائے دعائے زود اثر

سوئے حق ہوتا ہے مسلم کا سفر — ہو دعا سے تاکہ کوشش کارگر

شیخ نے شہ کی سنی اور چپ رہے — اور سب درویش بھی خاموش تھے

اک مرید اتنے میں اک نذرِ رہم لیے — بولا خاموشی کا جادو توڑ کے
لیجئے یہ نذر اے روشن ضمیر — راہِ حق گم کردگاں کے دستگیر
تر ہوئی ہے جب پسینے سے جبیں — تب بچایا یا ہوں یہ درہم کہیں
شیخ نے فرمایا درہم بخش دو — جامۂ شاہی ہیں اس کنگال کو
حکمراں افلاک و بحر و بر کا ہے — پھر بھی یہ مفلس زمانے بھر کا ہے
خوان پر غیروں کے ہیں نظریں لگی — بھوک سے اس کی یہ دنیا جل گئی
اک بلا ہے چل گئی جب اس کی تیغ — مٹ گئی دنیا اٹھی جب اس کی تیغ
اس کی ناداری سے نالاں ہیں سبھی — جس نے کمزوروں کی دنیا لوٹ لی
اس کی سطوت سے لٹے اہلِ جہاں — یہ ہے رہزن نوعِ انساں کارواں
اُنث خیالِ خود فریب و فکرِ خام — رکھ لیا تاراج کا تسخیر نام
فوجِ شاہی ہو کہ ہو فوجِ غنیم — دونوں اس کی بھوک سے اب ہیں سقیم
مرتے ہیں سائل تو اپنی بھوک سے — ملک و ملت حکمراں کی بھوک سے

جس کا خنجر بہرِ غیر اللہ اٹھا
اپنے خنجر سے وہ خود مارا گیا

(۱۵)

میر نجات نقش بند المعروف بہ بابائے صحرائی کی نصیحت
جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تحریر کی گئی

تو کہ مثلِ گُل اُگا ہے خاک سے
تو بھی فرزندِ خودی ہے جان لے

جَم خودی پہ اور بقا انجام بن
قطرہ ہو کر بھی محیط آشام بن

تو کہ ہے نورِ خودی سے ضو فشاں
کی خودی محکم تو ہوگا جاوداں

نفع ہے جس میں یہ ہے سودا وہی
ہے تحفظ سے اسی کے خواجگی

نیستی کا ڈر ہے ہستی کو تری
میرے پیارے بھول یہ کیسی ہوئی

چونکہ سمجھا ہوں حقیقت زیست کی
آ بتاؤں تجھ کو کیا ہے زندگی

غوطہ کھانا خود ہیں مانندِ گہر
پھر اُٹھانا اپنی خلوت گہ سے سر

جمع کرنا راکھ کے نیچے شرر
شعلہ بننا اور جلا دینا نظر

ہاں جلا دے محنتِ کسبِ علوم
شعلۂ جوّالہ بن گرد اپنے گھوم

زندگی ہے طوفِ دیگر سے نجات
کعبہ خود کو جاننا اے خوش صفات

اڑ کے جذبِ خاک سے آزاد ہو
مثلِ طائر بھول جا اُفتاد کو

گر نہیں طائر تو پھر اے دیدہ ور
غار کے منھ پر بسیرا ابھی نہ کر

تو کہ کوشاں ہے پئے کسبِ علوم | سنتا جا مجھ سے پیامِ پیرِ روم
"علم را بر تن زنی مارے بود (ﷺ) علم را بر دل زنی یارے بود"
سن چکا ہے؟ قصّہ استادِ روم | جو حلب میں دیتا تھا درسِ علوم
وہ جو تھا پابندِ توجیہاتِ عقل | اور غریقِ دخمۂ "ظلماتِ" عقل
موسیِ ناواقفِ سینائے عشق | سوزِ دل میں اور نہ کچھ سودائے عشق
کچھ تشکک اور کچھ اشراق سے | گفتگو تھی گوہرِ حکمت لیے
نکتہ ہائے قولِ مشائیں جو تھے (۱) اس کے نورِ فکر سے روشن ہوئے
ہر طرف رکھتا تھا انبارِ کتب | لب پہ رقصاں شرحِ اسرارِ کتب
پیرِ تبریزیؒ کہ تھا حکمِ کمالؒ (۲) پہنچے اک دن مکتبِ ملّا جلال
اور فرمایا یہ قیل و قال کیوں | یہ قیاس و وہم و استدلال کیوں
مولوی بولا خموش اے بے خبر | طنز ایسے قولِ حکمت پر نہ کر
میرے مکتب سے نکل۔ باہر تو جا | یہ ہے قیل و قال تو سمجھے گا کیا
"قال" میرا جس سے تو ہے اجنبی | روشنی ہے شیشۂ ادراک کی

(ﷺ) علم ہو تن کے لئے تو مار ہے | علم ہو دل کے لیے تو یار ہے

سوزِ شمسؒ اس بات سے بڑھنے لگا / جانِ تبریزی سے اک شعلہ اٹھا
فرش پر برقِ نظر فوراً گری / سوزِ دم سے خاک شعلہ بن گئی
خرمنِ ادراک جس سے جل اٹھا / فلسفی کا سارا دفتر راکھ تھا
مولوی ناواقفِ اعجازِ عشق / "ناشناسِ نغمہائے سازِ عشق"
چیخ اٹھا یہ آگ پیدا کیسے کی / سب متاعِ علم و حکمت پھونک دی
شیخ بولے "مسلمِ کفر آشنا / یہ ہے ذوق و حال تو سمجھے گا کیا
حال میرا ہے سمجھ سے تیری دور / کیمیا ہے میرے اس شعلے کا نور
تو نے پائی برفِ حکمت سے بہار / ہے سحابِ فکر تیرا ژالہ بار
آگ ان تنکوں سے پیدا کر ذرا / شعلہ اپنی خاک کو تو بھی بنا"
علمِ مسلم سوزِ دل کا نام ہے (۱) / ترکِ آفل معنیِ اسلام ہے

تارکِ آفل جب ابراہیمؑ تھے
شعلوں کے نرغے میں خوش بیٹھے رہے

علمِ حق تیری نظر سے گر گیا / نقدِ دیں روٹی کی خاطر دے دیا
جستجوئے سرمہ میں ہے دربدر / اپنی آنکھوں کی سیاہی بھول کر
مانگ اب خنجر سے آبِ زندگی / اژدہے کے منھ سے کیہ ژکی نمی

سنگِ اسود لے درِ بت خانہ سے
مشک کا نافہ سگِ دیوانہ سے

سوزِ عشق اور دانشِ حاضر چہ خوب
کیفِ حق اور ساغرِ کافر چہ خوب

ہیں کہ مدت تک تنگنائے دو میں رہا
رازدانِ دانشِ نو ہو گیا

باغبانوں نے لیا جب امتحاں
تب بنا یارا زدارِ گلستاں

گلستاں یہ عبرتوں کا لالہ زار
کاغذی پھولوں کی ہے اس میں بہار

چھوڑ کر آیا ہوں جب یہ گلستاں
نخلِ طوبیٰ پر ہے میرا آشیاں

دانشِ نو ہے حجابِ عقل و ہوش
بت تراش و بت پرست و بت فروش

یہ حدودِ حس میں گھر کر رہ گئی
قیدِ زندانِ مظاہر میں ہوئی

اور صراطِ زندگی سے گر گئی
پھیر لی اپنے گلے پر خود چھری

لائے تر کہیے اس کی آگ کو
شعلہ سرد اتنا کہ او لا بھی نہ ہو

اس کی فطرت سوزِ الفت سے تہی
جستجو کے ذوق سے عاری رہی

عشق ہے دانائے علّت ہائے عقل
جس کے نشتر سے کٹے سودائے عقل

کُل جہاں ساجد ہے اور مسجود عشق
بتکدے ہیں عقل کے محمود عشق

عشق اس دانش میں دیکھا ہے کہیں!
شورِ "یا رب" اس کی راتوں میں نہیں

تو نے اپنی قدر پہچانی نہیں — غیر کی عظمت پہ کر بیٹھا یقیں
مثلِ نَے تو خود سے ہی خالی ہو گیا — ہو گیا عاشق نوائے غیر کا
اے گدا و ریزہ چینِ خوانِ غیر — خواہش اپنی شے کی اور دکانِ غیر
بزم میں شعلے چراغِ غیر سے — جل گئی مسجد شرارِ دیر سے
جب سوادِ کعبہ سے آہو ہٹا — ناوکِ صیّاد کی زد میں گیا
مثلِ بوئے گل پریشاں بے محل — خود سے تو بھاگا ہے اپنے رخ پہ چل
تو کہ ہے قرآں کی حکمت کا امیں — ڈھونڈ لے کھوئی ہوئی وحدت کہیں
قلعۂ ملّت کے گو درباں ہیں ہم — چھوڑ کر مذہب نہیں کافر سے کم
اب کہاں پہلی سی وہ ساقی گری — بزمِ رندانِ حجازی لٹ چکی
بت ہمارے کعبے میں اب آ گئے — خندہ زن اسلام پر کافر ہوئے
اور بتوں کے عشق میں دیں ہار کے — کفر جوڑا شیخ نے اسلام سے
بال جن کے ہوں سفید اب وہ ہیں پیر — کھیل بچّوں کا بنے ہیں یہ شریر
قلب ان کا لا الٰہ بیگانہ ہے — حرص کے اصنام کا بت خانہ ہے
ہو گیا ہر زلف والا خرقہ پوش — آہ یہ سوداگرانِ دیں فروش
چیلے لے کر ساتھ روز و شب سفر — دردِ ملّت سے ہیں ظالم بے خبر

آنکھیں اندھی چشمِ نرگس کی طرح
سینے خالی جیبِ مفلس کی طرح

واعظ و صوفی ہوئے منصب پرست
اعتبارِ قوم نے پائی شکست

اپنا واعظ ہے رہینِ بت کدہ
فتووں کا تاجر ہے مفتی آج کا

دوستو سوچو کوئی تدبیر آج
چل دیا پینے ہمارا پیر آج

---

(۱۶)

اَلْوَقْتُ سَیْفٌ (وقت تلوار ہے)

گل فشاں ہو خاکِ پاکِ شافعیؒ
ان کی مے سے سب کو مستی مل گئی

فکر نے ان کے کواکب چن لیے
سیفِ براں وقت کو وہ کہہ گئے

کیا بتاؤں راز اس شمشیر کا
تیغ ہے یہ حاملِ آبِ بقا

اس کا مالک فاتحِ امید و بیم
ہاتھ جس کا رشکِ دستِ کلیم

سنگ اس کی ضرب سے ہوتا ہے تر
خشک ہو کر بحر بن جاتا ہے بر

دستِ موسیٰ میں یہی تلوار تھی
کب کوئی تدبیر انھیں درکار تھی

گرد یا دریا نے احمر اس نے چاک (۱) اور سمندر کو سکھایا مثلِ خاک

ساعدِ حیدرؑ کہ خیبر گیر تھی — اس کی قوت بھی یہی شمشیر تھی

گردشِ افلاک پر کر لے نظر — انقلابِ روز و شب پر غور کر

لمحوں کے قیدی بچشمِ غور دیکھ — اپنے دل میں ایک دنیا اور دیکھ

تخمِ ظلمت اپنے دل میں بو دیا (۱) — وقت کو بھی ایک خط سمجھا کیا.

لے کے پھر پیمانۂ لیل و نہار — ناپنے بیٹھا ہے طولِ روزگار

کر لیا اس رشتے کو زنّار دوش — ہو گیا مثلِ بتاں باطل فروش

کیمیا تھا اور مشتِ گِل بنا — سرِّ حق پیدا ہوا باطل بنا

اے مسلماں چھوڑ اس زنّار کو (۲) — شمعِ بزمِ ملّتِ احرار ہو

تو کہ ہے اصلِ زماں سے بے خبر — ہے حیاتِ جاوداں سے بے خبر

روز و شب کی قید آخر کس لیے (۳) — لی مع اللہ سے ہی رازِ وقت لے

ہے سبھی کچھ زادۂ رفتارِ وقت — زیست ہے منجملۂ اسرارِ وقت

نیّرِ تاباں نہیں اصلِ زماں — وقت تو ہے وہ نہیں ہے جاوداں

عیش و غم عاشور و روزِ عید وقت (۴) — سرِّ تنویرِ مہ و خورشید وقت

وقت کو مثلِ مکاں پھیلا دیا — امتیازِ دوش و فردا کر لیا

اڑ کے مثلِ بو خود اپنے باغ سے — زنداں اک پیدا کیا اپنے لیے

وقتِ آدم کا نہیں کوئی سِرا
یہ ضمیرِ آدمی سے ہے اُگا

زندہ اس کی معرفت سے زندہ تر
ہوتا ہے وہ صبح سے تابندہ تر

اصل میں ہیں ایک دہر و زندگی
لَاتَسُبُّوا الدَّھْر ہے قولِ نبیؐ (۱)

نکتہ سمجھاؤں تجھے اک مثلِ دُر (۲)
ہو تجھے پھر امتیازِ عبد و حُر

عبد کو چکراتے ہیں لیل و نہار
اور دلِ حُر میں ہے غلطاں روزگار

عبد روز و شب سے بُنتا ہے کفن
ہے یہی اس کے لیے بس پیرہن

آب و گِل سے ہو کے آخر حُر جدا
پیرہن بنتا ہے خود ایام کا

عبد اک طائر بہ دامِ صبح و شام
لذتِ پرواز ہے جس پر حرام

سینۂ حُر سینہ چابک نفس
طائرِ ایام کا سنگیں قفس

عبد ہے تحصیلِ حاصل کا اسیر
رکھتا ہے ایجاد سے خالی ضمیر

حلقۂ زنجیر میں اس کا قیام
شغل اس کا نالہ ہائے صبح و شام

دم بدم ایجادِ نو کی حُر کو دُھن
ساز سے اُٹھتی ہے اس کے تازہ دھن

اس کا دل تکرار پر آتا نہیں
دائرے میں وہ چلے جاتا نہیں

روز و شب میں عبد کی زنجیر پا
روتا ہے تقدیر کا رونا سدا

ہمتِ حُر ہے قضا کی بھی مشیر
جس کے ہاتھوں حادثے صورت پذیر
آج اور کل سب ہیں اسکے حال میں
عجلتوں میں اس کی تاخیریں ملیں
بر سخن صوت و صدا سے پاک ہے
ماورائے پنجۂ ادراک ہے
حرف معنے سے ہو شرمندہ مرا
شکوۂ معنے سے اس کو واسطہ؟
زندہ معنے حرف بن کر مر گیا
سوز اس کا تیرے دم سے چل بسا
دل ہے بس نکتۂ غیب و حضور
اور وہیں ہے رمزِ ایام و مرور

رکھتا ہے خاموش نغمہ سازِ وقت
ڈوب کر دل میں سمجھ لے رازِ وقت

آہ کیا دن تھے کہ سیفِ روزگار
تھی ہمارے آہنیں بازو کی یار
تخمِ دیں ہم نے دلوں میں بو دیا
عارضِ حق رونما ہم نے کیا
عقدے کھولے ہم نے دنیا کے سبھی
سجدوں سے قسمت جگا دی خاک کی
کی عطا صہبائے حق شام و سحر
کہنہ میخانوں پہ شبخوں مار کر
اے کہ تیرے شیشے میں ہے کہنہ مے
گرمیِ مے سے یہ شیشہ آب ہے
تو برایں نخوت غرور و کبر و ظن
کیوں ہمارے حال پر ہے طعنہ زن
تھا ہمارا جام اک دن زیبِ بزم
سینے میں دل رکھتے تھے اور دل میں عزم

یہ ہماری گردِ پا کی ہے عطا
عصرِ نو ہے جلووں سے آراستہ

کشتِ حق اپنے لہو سے سینچ دی
اہلِ حق اس کے ہیں ممنون آج بھی

ہم سے ہی تکبیر دنیا کو ملی
اپنی مٹی کعبوں کے کام آگئی

حرفِ اِقرا ہم نے دُنیا کو دیا
حق نے ہم کو قاسمِ نعمت کیا

اب نہیں گر صاحبِ تاج و سریر
ہم فقیرِ دل کو نہ جان اتنا حقیر

تو سمجھتا ہے زیاں کار اب ہمیں
خوار و فرسودہ ہیں تیری رائے میں

اعتبارِ لا الٰہ رکھتے ہیں ہم
دونوں عالم پہ نگہ رکھتے ہیں ہم

اور غمِ امروز و فردا چھوڑ کے
ہم کسی سے عہدِ اُلفت کر چکے

قلبِ حق میں سرِّ مکنوں ہیں ہمیں
وارثِ موسیٰ و ہارون ہیں ہمیں

روشنی ہم سے ہے مہر و ماہ کی
اس گھٹا میں بجلیاں بھی ہیں ابھی

ذاتِ حق کا آئینہ ہے اپنی ذات
ہم میں ہی آیاتِ حق کی ہیں صفات

---

(۱۷)

دعا

پیکرِ ہستی میں تو ہے مثلِ جاں — کیوں گریزاں ہم سے ہے جانِ جہاں
سازِ ہستی میں ہے تجھ سے نغمگی — تجھ پہ جاں دینا ہے رشکِ زندگی

آ۔ سکونِ خاطرِ ناشاد ہو — آ کے پھر ان سینوں میں آباد ہو
پھر طلب کر ہم سے ننگ و نام کو — پختہ کر دے عاشقانِ خام کو

آج ہیں تقدیر سے بیزار ہم — تیرا نرخ اونچا ہے اور نادار ہم
مفلسوں سے مت چھپا اپنا جمال (۱) کر دے ارزاں عشقِ سلمان و بلال

چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب دے — اب ہمیں پھر فطرتِ سیماب دے
کر نمایاں ایک آیت پھر کہیں (۲) تاکہ ہوں اعناقِ اعدا خاضعیں

اب بنا اس تنکے کو آتش فشاں — اور جلا دے اپنے غیروں کا جہاں
رشتۂ وحدت گیا جب ہاتھ سے — ہم مسلماں الجھنوں میں گھر گئے

تاروں کے مانند ہیں بکھرے ہوئے — تھے جو ہمدم آج بیگانے ہوئے
جزو بندی کر انہیں اوراق کی — عشق کے آئین کو دے تازگی

پھر شرفِ خدمت کا ہم کو بخش دے — عاشقوں سے اپنے کوئی کام لے

رہروِ دل کو منزلِ تسلیم دے
قوّتِ ایمانِ ابراہیمؑ دے
شغلِ لَا سے عشق کو آگاہ کر
آشنائے رمزِ اِلّا اللّٰہ کر

شمعِ ساں ہر دو سروں کا غم مجھے
سوزِ دل کی کہہ رہا ہوں بزم سے
یارب! اک آنسو کہ جو ہو دل فروز
"بے قرار و مضطرب آرام سوز"
باغ میں بو دوں تو وہ شعلہ اُگے
آگ جو دھو دے قبائے لالہ سے

یادِ ماضی اور کل کا انتظار
بزم میں تنہا ہوں ساتھی ہے نہ یار
دیکھیے جس کو وہ ہے ہمدم مرا
کوئی بھی میرا نہیں راز آشنا
ہم نفس دنیا میں میرا ہے کہاں
طور ہوں میں میرا موسیٰ ہے کہاں
اپنی جاں پر یہ ظلم میں نے کیا
پرورش دامن میں شعلہ کر لیا
شعلہ اک غارت گرِ سامانِ ہوش
جس نے خاکستر کیا دامانِ ہوش
عقل میں دیوانگی اس نے جگائی
علم کی ہستی کو آگ اس نے لگائی

مثلِ شبنم دیدۂ گریاں ہوا
سوزِ پنہاں دل کو آخر مل گیا
شمع کو سوزِ عیاں میں نے دیا
چھپ کے سب سے خود مگر جلنے لگا
ہر بُنِ مو سے اٹھے شعلے ہزار
ہو گئی موجِ تخیّل شعلہ بار

میرے بلبل نے شرارے چگ لیے ‌ ‌ اس کے نغمے آگ برسانے لگے
عصرِ نو کا سینہ ہے دل سے تہی ‌ ‌ قیس ہے بے تاب لیلےٰ کھو گئی
جلنا تنہا شمع کا آساں نہیں ‌ ‌ ایک پروانہ مرے شایاں نہیں
انتظارِ غمگسار اب تابہ کے ‌ ‌ جستجوئے رازدار اب تابہ کے
نجم و مہ روشن ہیں تیرے نور سے ‌ ‌ آگ اپنی مجھ سے یارب پھیر لے
یہ امانت پھیر لے اس سینے سے ‌ ‌ خارِ جوہر کھینچ اس آئینے سے
یا مجھے اک ہمدمِ دیرینہ دے ‌ ‌ عشقِ عالم سوز کو آئینہ دے
ہے مقدر موج موجوں میں رہے ‌ ‌ ساتھ ہمدم کے تڑپنا ہے اسے
تارے سے تارے کی بھی ہے دوستی ‌ ‌ قرب کے زانو پہ ہے فرقِ ماہ بھی
دن اندھیری رات سے ہے ہمکنار ‌ ‌ ہو گئے امروز و فردا رشتہ دار
نہر میں گم ہوتی ہے بیتاب نہر ‌ ‌ اور خوشبو میں صبا کی تیز لہر
ہائے وہو ہر دم ہے ویرانے کے ساتھ ‌ ‌ رقص میں دیوانہ دیوانے کے ساتھ
گرچہ اپنی ذات سے یکتا ہے تو ‌ ‌ اپنی خاطر ہی جہاں آرا ہے تو
کیوں مثالِ لالۂ صحرا ہوں میں ‌ ‌ درمیانِ انجمن تنہا ہوں میں
چاہتا ہوں تجھ سے میں اک غمگسار ‌ ‌ جو کہ ہو فطرت کا میری رازدار

وہ جو دیوانہ بھی ہو فرزانہ بھی　　　این و آں کی فکر سے بیگانہ بھی
تاکہ اس کی جاں کو اپنا شور دوں　　　اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھ لوں

ڈھال دوں پیکر وہ اپنی خاک سے
خود بت و بت گر ہوں جس کے لیے

ایک وضاحت

"اسرارِ اقبال" میں جن کتابوں کی انگریزی عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے ان کے نام (اردو ترجمے کے ساتھ) حسبِ ذیل ہیں۔ آئندہ سطور میں اردو ناموں ہی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اقبال :۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید

IQBAL - Reconstruction of Religious Thought In Islam-LAHORE, 1944

ایس۔اے واحد :۔ اقبال، اس کا فکر و فن

S. A. Vahid-Iqbal His Art & Thought
Lahore, 1944

اقبال : مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف)

IQBAL - Letter to Prof. R A. Nicholson
(Introduction to, Secrets of the self-LAHORE, 1944)

خواجہ غلام السیدین : اقبال کا فلسفۂ تعلیم

K.G. Saiyidain - Iqbal's Educational Philosphy-
Lahore, 1945

" ول ڈوراں :۔ سرورِ فلسفہ

WILL DURANT – Pleasures of Philosphy

New York – 1953

پروفیسر نکلسن :۔ ترجمہ اسرارِ خودی

Prof. R.A. Nicholson, Secrets of the self LAHORE,

1944

" عربی - فارسی اور انگریزی کی لغات

Dictionary, Persian, Arabic and English by Francis Johnson. London–1852

" اے - ایچ - جے نائٹ :۔ نطشے کی زندگی اور تصانیف کے چند رُخ

A.H.J. Knight – Some aspeets of the life and work of Nietzche

---

حاشیے اور حوالے

صفحہ نمبر	حاشیہ نمبر	
۱۷	۱	اقبال:- ضربِ کلیم (وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا)
	۲	اقبال:- بالِ جبریل (ساقی نامہ)
۱۸	۱	اقبال:- دیباچہ اسرارِ خودی (پہلا ایڈیشن)
	۲	اقبال:- اسرارِ خودی
	۳	اقبال:- اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید، صفحات ۷، ۵۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۱۲۳
	۴	اقبال:- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص ۱۷
	۵	ایس۔ اے واحد:- اقبال، اس کا فکر و فن ص ۲۳ (اس باب میں تخلیق اور تکوین کا فرق نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔)
۱۹	۱	قدر آفریں = Appreciative مؤثر Efficient
	۲	آنات۔ آن کی جمع ہے۔ آن بمعنے لمحہ۔ پل
۲۰	۱	اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید ص ۴۹-۹۰
	۲	برگساں (Henri Bergson) نامور فلسفی ایک برطانوی پولستانی یہودی کنبے کا فرد تھا۔ ۱۸۵۹ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ زمان اور وجدان کے بارے میں اس کے خیالات فکر انگیز ہیں۔ اس کا نظریہ "ارتقائے ظہوری" (Emergent Evolution) داستان ارتقا کا قابلِ غور باب ہے جس کے بموجب تخلیق و ارتقا کا جوہر جوشِ نمو "Elan Vital" ہے۔
	۳	واحدۂ سربستہ = Closed off Unity
	۴	متکملیت = Perfection
۲۱	۱	اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید ص ۹۳

شمار صفحہ نمبر	حاشیے	
۲۱	۲	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۷۷
	۳	اقبال: " " " ص۷۸
	۴	حرکتِ موجی کی تیزی = Frequency of Wave Movement
	۵	ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے "ارتعاشات" کو درجات بھی کہہ سکتے ہیں
	۶	زمان متواتر = Serial Time.
		دوراں = Duration
۲۲	۱	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۵۰
	۲	اقبال :- " " " ص۴۷-۴۸
	۳	قرآن مجید :- القمر (۵۴-۵۰)
۲۳	۱	اقبال :- دیباچہ اسرار خودی (پہلا اڈیشن)
	۲	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۶۳
	۳	قرآن مجید :- (الاخلاص ۱۱۲)
۲۴	۱	حضرت علیؓ :- نہج البلاغۃ (خطبات) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء ص۱۲۱-۱۲۲
	۲	حضرت علیؓ :- " " ص۱۲۰
	۳	حضرت علیؓ :- " " ص۱۲۱
		(اللہ کے نفس میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔)
	۴	حضرت علیؓ :- نہج البلاغۃ، خطبات، ص۱۲۰
		(جس نے ذاتِ الٰہی میں تقسیم مانی وہ نادان ہے)
	۵	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۷۷ (بحوالہ ملا باقر)
۲۵	۱	اقبال :- بالِ جبریل (ساقی نامہ)
	۲	اقبال :- خودی کا وجود اس کی نمود، وجود حق اور نمود حق سے ہے

صفحہ	شمار	حاشیہ
	۳	خواجہ غلام السیدین :- اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص۲
۲۶	۱	اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۱۹
	۲	اقبال :- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۱۷۱
	۳	اقبال :- بالِ جبریل (ساقی نامہ)
	۴	ایغو (Ego) سے (Self) بھی مراد ہوتی ہے۔ اردو میں یہ لفظ خودی اور انا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسیات کی وہ معروف اصطلاح جسے فرائڈ Sigmund Freud کے نظریات سے خاص نسبت ہے لیکن اقبال کی خودی اور فرائڈ کے ایغو میں کوئی قابلِ ذکر مشابہت تلاش کرنا بے سود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال، فرائڈ کے چند نتائج فکر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے (اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۲۵) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے تصورِ خودی کا خاکہ فرائڈ کے ایغو سے ماخوذ نہیں۔
	۵	اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۱۹
۲۷	۱	اقبال :- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۳۷
	۲	کشیدگی :- Tension
	۳	اقبال :- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۱۰۲
	۴	من امیت I-amness
		اقبال :- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۵۷
	۵	اقبال :- " " " ص۸۹
	۶	دِل دُوراں :- سرورِ فلسفہ ص۲۹۲
	۷	اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲
۲۸	۱	اقبال :- " " " ص۲۱-۲۲

صفحہ شمار | کا حاشیہ

۲۸ | ۲ | قرآن مجید :- الاحزاب (۳۳، ۲۱)؛ اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۳۵
| ۳ | خواجہ غلام السیدین :- اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص۲۸
۲۹ | ۱ | خواجہ غلام السیدین : " " ص۲۹
| ۲ | ایس۔ اے واحد :- اقبال اس کا شکر و فن ص۴۵-۴۶
۳۰ | ۱ | اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۲
| ۲ | ایس۔ اے واحد : اقبال اس کا فکر و فن ص۵۶
| ۳ | ایس۔ اے واحد :- " " ص۵۶
| ۴ | اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۷
۳۱ | ۱ | اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۱۴۲
| ۲ | یہ قول حضرت علیؓ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے (ٹ۔ ج دی بوئر : تاریخ فلسفۂ اسلام۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین، مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۶ء ص۲۷)
۳۳ | ۱ | اقبال :- بالِ جبریل (روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔)
۳۴ | ۱ | اقبال :- اسرار خودی۔ ممکنات قوت مردانِ کار۔ گردد از مشکل پسندی آشکار
| ۲ | اقبال :- پیام مشرق :- تو شب آفریدی چراغ آفریدم۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم
| ۳ | حضرت جلال الدین محمد بن بہاء الدین محمد بن الحسین البکری المعروف بہ مولانا روم ؒ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ کم سنی ہی میں شیخ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات ہو گئی تھی۔ شیخ نے ہونہار دیکھ کر اپنا اسرارنامہ عطا کر دیا۔ والد کے انتقال کے بعد کئی شہروں میں تعلیم مکمل کر کے قونیہ میں آکر ٹھہر گئے۔ اسی دوران شمس تبریزؒ کے مرید ہوئے۔ جو کچھ عرصے کے بعد قونیہ چھوڑ کر اپنے وطن تبریز چلے گئے۔ ان کے فراق میں مولانا کے دل کا سوز و گداز اتنا بڑھا کہ عالم وارفتگی میں وہ اشعار

صفحہ کی شمار	حاشیہ
	کیے جن کا مجموعہ مشہور و معروف "مثنوی مولانا روم" ہے ۔ ۶۷۲ھ میں وفات پائی مزار مبارک قونیہ (ترکی) میں ہے (مہدی حسن ناصری :۔ صنادید عجم ۔ الہ آباد ۱۹۲۴ء ص ۱۸۶-۱۸۸)
۳۵	۱؎ بے ہودہ کوشش سوتے رہنے سے بہتر ہے ۔
	۲؎ ایس ۔ اے واحد :۔ اقبال اس کا فکر و فن ص ۹۷
۳۷	۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ اقبال :۔ بال جبریل (ساقی نامہ)
۳۰	۱؎ اقبال :۔ پیام مشرق ۔ تو اگر زندگی کے راز سے واقف ہے تو ایسے دل کو تلاش نہ کر اور ایسا دل مت لے جو خار آرزو کی خلش سے عاری ہو ۔
	۲؎ اقبال :۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص ۲
۳۹	۱؎ خواجہ غلام السیدین :۔ اقبال کا فلسفہ تعلیم ص ۵۵
	۲؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔ روح اقبال مطبوعہ دہلی ۱۹۶۶ء ص ۱۲۶
	۳؎ اقبال :۔ بال جبریل (ساقی نامہ)
	۴؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں : روحِ اقبال ۱۹۶۶ء ص ۱۲۸
۴۰	۱؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔ " " ص ۱۲۹
	۲؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔ " " ص ۱۳۰
	۳؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔ " " ص ۱۲۹
	۴؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :۔ " " ص ۱۳۰
	۵؎ اقبال :۔ جاوید نامہ :
	۶؎ اقبال :۔ جاوید نامہ
۴۱	۱؎ اقبال :۔ اسرار خودی

شمار صفحہ کا	حاشیہ	
۴۲	۱	ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ روح اقبال ص۱۳۱
	۲	ایس اے۔ واحد: اقبال اس کا فکر و فن ص۹۵
	۳	ایس۔ اے واحد:۔ ،، ،، ص۹۴
۴۳	۱	اقبال: بال جبریل (مسجد قرطبہ)
	۲	اقبال:۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۵
	۳	اقبال: بال جبریل
	۴	ایس۔ اے واحد:۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۹
	۵	خواجہ غلام السیدین:۔ اقبال کا فلسفہ تعلیم ص۱۴۳
	۶	اقبال:۔ جاوید نامہ:۔ جس کو خوراک کے لیے جو کی روٹی کافی ہو۔ اس کا عشق خیبر کا دروازہ اکھاڑ لیتا ہے۔ اور عشق چاند کو چاک کر دیتا ہے
۴۴	۱	ایس اے۔ واحد:۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۹۲
	۲	حضرت بایزید بسطامیؒ (م۔ ۸۷۵ء)
	۳	اقبال:۔ ضرب کلیم
۴۵	۱	قرآن مجید:۔ البقرہ (۲ - ۲۷۳)
۴۶	۱	قرآن مجید:۔ ص (۳۸ : ۲۴)
	۲	اقبال:۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۶
	۳	اقبال:۔ بال جبریل (گدائی)
۴۸	۱	سب سے بہتر دولت مندی، دل کا غنی ہونا ہے۔
	۲	اے مرد فقیر! زہد اور تقویٰ کیا ہے؟ کسی بادشاہ یا امیر سے کوئی غرض نہ رکھنا اگر تجھے بے شمار دولت مل جائے اور تیری ہمت بلند نہ ہو تو وہ دولت بیکار ہے
۴۹	۱	مولانا سید محمد میاں:۔ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء

صفحہ نمبر | حاشیہ

۴۹ صفحات ۳۵ لغایتہ ۴۰-۵۰-۵۱-۴۴-۱۶۲

خوط = منصف تحصیلدار - حاکم

۵۰ ۱ اقبال:- ضربِ کلیم (نفسیاتِ غلامی)

۵۱ ۱ طالب صفوی:- ینابیع التصوف - مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۵۵

۲ برٹرینڈ رسل Bertrand Russell اس صدی کا مشہور برطانوی ریاضی داں اور فلسفی

۳ وِل ڈوراں: سرورِ فلسفہ صفحہ ۳۶

" ناصرہ (Nazareth) فلسطین کا ایک قصبہ جو مسیحی تبلیغ کا مرکز رہا ہے۔

۵۲ ۱ طالب صفوی: ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء صفحہ ۷۶ (بحوالہ الملل والنحل ترجمہ، مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ صفحہ ۸)

۲ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: خلافت و ملوکیت مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۹۶

۵۳ ۱ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- " " صفحہ ۱۷۰

۲ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- " " صفحہ ۱۹۶

۳ طالب صفوی:- ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء صفحہ ۷۷

۴ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- خلافت و ملوکیت ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۹۶

۵ ان لوگوں کی نظر میں آخرت کے لیے عمل سے مراد "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" ہوگی۔

۶ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- خلافت و ملوکیت ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۰۰

۷ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: " " صفحہ ۱۹۹

۵۴ ۱ عین = تصور (Idea) عیان جمع ہے۔

عینیت = تصوریت Idealism عینیین Idealists

شمار صفحہ	حاشیہ
۵۵	لے وِل ڈوراں :۔ سرورِ فلسفہ ص۳۵
	۲ے وِل ڈوراں :۔ " ص۱۷
۵۶	لے نوافلاطونیت Neo-Platonism
	۲ے طالب صفوی - ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء ص۲۵۵
	۳ے فلاطنس (Plotinus) لاطینی نسل کا یہ مصری حکیم ۲۰۵ء میں پیدا ہوا اور ۲۷۰ء میں بمقام روم انتقال کر گیا۔ "لا شیئے" سے تخلیقِ عالم کا قائل تھا اور افلاطون کی طرح ماورٰی الکائنات اور عقل و عقلیات سے بالاتر غیر مجسم خدا کو مانتا تھا (پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے ۔ مترجمہ طالب صفوی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص۱۰۵)
	اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا مگر اس کے خیالات اپنے پیش رو سے کچھ اس قدر مختلف تھے کہ افلاطون سے ان کی نسبت بھی غلطی ہے۔ (مالک رام، ایم۔اے: نیرنگ خیال (اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء ص۱۲۹ (فٹ نوٹ)
	" فیثاغورث - (Pythagoras) یونانی فلسفی اور ریاضی داں (چوتھی - پانچویں صدی قبل مسیح)
	۴ے پروفیسر آرم اسٹرانگ :۔ دیباچہ' پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے مترجمہ طالب صفوی صفحات ۴۲' ۱۹-۲۰
	" وسطی افلاطونی فلسفے کا اثر نہ صرف ناستک فرقے کے افراد پر پڑا' بلکہ جادوگروں اور کیمیا کے شائقین کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے جو مذہب اور فلسفے میں مطابقت کی کوشش کرتے تھے۔ (طالب صفوی :۔ پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے ص۱۷)

صفحہ نمبر | حاشیہ

۵۷ | ۱ه طالب صفوی:۔ پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے ص۹۱-۹۲

۵۸ | ۱ه طالب صفوی:۔ دیباچہ پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے ص۵

۲ه طالب صفوی:۔ ینابیع التصوف ص۱۶۷

۳ه مولانا سید محمد میاں:۔ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ص۳۱

۵۹ | ۱ه ڈاکٹر یوسف حسین خاں:۔ روحِ اقبال ص۱۳۱-۱۳۲

۶۰ | ۱ه، ۲ه اقبال: ضربِ کلیم (صوفی سے) اور (تصوف)

۶۱ | ۱ه ڈاکٹر یوسف حسین خاں:۔ روحِ اقبال ص۱۳۶-۱۳۷، ۱۳۹ لغایت ۱۴۱

۲ه اقبال:۔ ضربِ کلیم۔

۶۲ | ۱ه ایٹلا Attila ہنوں کا بادشاہ (تقریباً ۴۰۶ء سے ۴۵۳ء) اسے خدائی تازیانہ کہا جاتا ہے۔ اس کی فوجوں نے مشرقی یورپ سے بڑھ کر یورپ کے بیشتر حصہ کو روند ڈالا تھا۔

۲ه چنگیز خاں۔ منگول خوں ریز شہنشاہ (۱۱۶۲ء۔ ۱۲۲۷ء) جس کی فوجوں نے چین۔ روس۔ ایران۔ ہندوستان وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا۔

۶۳ | ۱ه اقبال:۔ دیباچہ مرقع چغتائی (ڈاکٹر یوسف حسین خاں:۔ روحِ اقبال ۱۹۶۶ء ص۱۵)

۲ه ڈاکٹر یوسف خاں:۔ روحِ اقبال ۱۹۶۶ء صفحات ۲۲، ۱۵، ۲۵، ۲۹، ۱۷

۶۴ | ۱ه اقبال: ضربِ کلیم (تربیتِ خودی)

۶۵ | ۱ه قرآن مجید: الاحزاب (۲۳: ۷۲)۔ اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید ص۸۹

۲ه خواجہ غلام السیدین۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص۴۳

۳ه اقبال: اسرارِ خودی۔ آزاد مرد کا کام ہر گھڑی نت نئی تخلیق میں لگا رہنا ہے
اس کے ساز کے تاروں سے مسلسل نئے نغمے پیدا ہوتے ہیں
اس کی فطرت کبھی بھی دہرانے کی زحمت نہیں اٹھاتی کیونکہ
اس کا راستہ پرکار کا حلقہ نہیں ہوتا۔

صفحہ نمبر	حاشیہ نمبر	
۶۷	۱	اقبال:- بالِ جبریل۔
	۲	اقبال: اسرارِ خودی۔ سبزہ، دینِ نمو کا پابند ہو کر اگا ہے اور اسے ترک کرنے کی وجہ سے روندا گیا ہے۔
	۳	اقبال: اسرارِ خودی:- آئین کی سختی کا شکوہ مت کر۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی حدوں سے باہر نہ جا۔
۶۸	۱	قرآن مجید:- البقرہ (۲ : ۳۰، ۳۳)
۶۹	۱	اقبال: پیامِ مشرق: عشق نے نعرہ لگایا کہ خونیں جگر پیدا ہو گیا حسن لرز اٹھا کہ ایک صاحب نظر پیدا ہوا۔ فطرت بے حواس ہوئی کہ اس جہانِ مجبور کی خاک سے ایک خود شکن خودگر و خودنگر نے جنم لیا۔ آسمان سے شبستانِ ازل کو پیغام پہنچا کہ اے پردہ دارو! بچکر رہو۔ کیونکہ حجابات اٹھانیوالا پیدا ہوا۔ آغوشِ حیات میں اپنے سے بے خبر آرزو نے آنکھ کھولی اور دوسرا جہان رونما ہو گیا۔
	۲	اقبال:- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲
	۳	اقبال:- ضربِ کلیم
۷۰	۱	یداللہ۔ اللہ کا ہاتھ۔ حضرت علی کا لقب ہے۔
	"	انا مدینۃ العلم و علیؓ بابہا (میں علم کا شہر اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں) حدیث مشہور
۷۱	۱	(معجزہ رجعت خورشید۔ نور الانوار ص۱۰۹ بحوالہ کتاب اکسیر حاشیہ نور الانوار ص۹
۷۲	۱	پروفیسر نکلسن: ترجمہ اسرارِ خودی ص۹۵ (فٹ نوٹ)
	"	ایس۔ اے واحد:- اقبال اس کا فکر و فن ص۱۱
۷۳	۱	ابو العلا احمد بن عبداللہ بن سلیمان المعری التنوخی (۹۷۳ء۔ ۱۰۵۷ء)

ادیب۔ شاعر لغوی۔ نحوی فلسفی۔ طنز نگار معلم اخلاق۔ قنوطی۔ تارکِ دنیا
منکر خدا جس کی تصانیف "الغفران" اور "لزومیات" ہیں۔

ٹلہ لزوبات۔ معرّی کے قصائد کا مجموعہ۔ لزومیات کو لزوبات نظم کیا ہے۔

ٹلہ اقبال:۔ بالِ جبریل۔ (ابو العلا معرّی)

ٹلہ نطشے (Friedrieh Wilhelm Nietzche) ۱۸۴۴ء۔ ۱۹۰۰ء

جرمن فلسفی جس کے تصورات سے یورپ بہت متاثر ہوا۔ یورپ کے جنگ بازو
میں اس درجہ مقبول تھا کہ ایڈولف ہٹلر نے اپنے دست راست بنیٹو مسولینی
کی ساٹھویں سالگرہ پر اسکی تصانیف کا مجموعہ تحفے میں بھیجا تھا۔
ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۷۲ء ص۱۷۶ بحوالہ رچرڈ کولیر۔ ڈوچے دی ڈیزاف ریکے

۷۴ | لہ ایس۔اے۔واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۱۳۳-۱۳۴

۷۵ | لہ اقبال: اسرارِ خودی۔ جو خودی کے مقامات سے واقف ہو وہ طاقتور
دشمن کو خدا کا فضل سمجھتا ہے۔

۷۶ | لہ ایس۔اے واحد:۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۱۳۶

۷۷ | لہ عربی۔ فارسی اور انگریزی کی لغات ص۶۳۵

۷۹ | لہ اقبال:۔ ضربِ کلیم (قوّت اور دین)

ٹلہ فسطائی (Fascist) فسطائیت کو ماننے والا

فسطائیت (Fascism) سامراج اور سرمایہ داری کی ایک صورت
جو ۱۹۱۹ء کے آس پاس اٹلی میں نمودار ہوئی۔ اٹلی کے آمر بنیٹو مسولینی نے
اسے بہت تقویت دی۔ یہ آئینی حکومت سے متعلق ہر تصور کی مخالف ہے
رنگ و نسل اور ایسی وطن پرستی کی علامت جو خوں خوار ہو۔

۸۱ | لہ ایس۔اے۔ واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۱۲۳ (بحوالہ اے ایچ جے ناٹ)

نطشے کی زندگی اور تصانیف کے چند رخ ص۱۲۷)

۸۱ ۵ سادیت پسند (Sadist) سادیت (Sadism) نفسیات کی اصطلاح ہے اور اس حالت کو ظاہر کرتی ہے جس میں جنسی لذت تکلیف اور اذیت پہنچانے نیز تباہ کرنے سے وابستہ ہو جائے (جنسی دیوانگی)

۶ ایس۔ اے۔ واحد:۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۱۲۳-۱۲۴

۸۲ ۱ اقبال:۔ ضرب کلیم

۲ پروفیسر نکلسن:۔ ترجمہ اسرار خودی ص۱۱۵ (فٹ نوٹ)

حضرت میاں میرؒ۔ مشہور درویش سنہ وفات ۱۶۳۵ء مزار لاہور میں ہے۔

۳ اقبال:۔ اسرار خودی جس نے اپنا خنجر اللہ کے مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے اٹھایا تو اس کا خنجر اسی کے سینے میں پیوست ہوا۔

۸۳ ۱ پروفیسر نکلسن:۔ ترجمہ اسرار خودی ص۱۲۲ (فٹ نوٹ)

۸۴ ۱ بانگ درا

۲ صنعتی انقلاب Industrial Revolution برطانوی معاشرت و معیشت کا وہ انقلاب جو مشینوں اور بالخصوص بھاپ سے چلنے والے انجنوں کے سبب رونما ہوا۔ اس کے نتیجے میں گھریلو صنعتوں کا دور ختم ہو کر فیکٹریوں اور ملوں کا دور شروع ہوا۔ یہ ۱۷۵۰ء کے آس پاس شروع ہو کر ۱۸۵۰ء تک ختم ہو لیا تھا اور اس کا اثر پوری دنیا پر پڑا۔

۳ سامراج = رجعت پسندی اور تشدد کی وہ کوشش جو زور زبردستی کے ذریعہ علاقائی الحاق کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ سامراج = سرمایہ داری کی اجارہ دارانہ منزل

۴ اقبال: بالِ جبریل (لینن خدا کے حضور میں)

صفحہ نمبر | حاشیہ

۸۵ لہ اقبال: ضربِ کلیم (دوزخی کی مناجات)
۸۶ لہ صفحہ ۱۴۲ کا حوالہ ۳ ملاحظہ ہو۔
لہ اقبال: ضربِ کلیم
لہ اقبال: اسرارِ خودی۔ اے دوستو اب کیا تدبیر ہو۔ ہمارے پیر کا رخ۔۔
توے خانہ کی طرف ہے۔
۸۸ لہ اقبال: بالِ جبریل
لہ اقبال:۔ جاوید نامہ۔ ہر تدبیر میری تقدیر سے وابستہ ہے۔ صاحب زبان اور بے زبان سب میرے شکار ہیں۔ شاخ میں کلی میرے طفیل پروان چڑھتی ہے۔ پرندہ میری وجہ سے نالہ کش ہوتا ہے۔ میری پرواز سے دانہ پودے میں تبدیل ہوتا ہے میرے فیض سے ہر جدائی وصل بنتی ہے۔ میں ہی عتاب ہوں۔ میں ہی خطاب ہوں اور میں ہی پیاس دیتا ہوں تاکہ شراب عطا کر سکوں۔ میں حیات ہوں۔ میں موت ہوں میں ہی حساب یوم حشر ہوں۔ میں ہی دوزخ ہوں۔ میں ہی جنت اور میں ہی حور ہوں۔ آدمی اور فرشتہ دونوں میرے اسیر ہیں۔ یہ چھ دن میں ظاہر ہونیوالا عالم بھی میرا ہی پیدا کردہ ہے۔ میں ہی وہ پھول ہوں جو تو شاخ سے توڑتا ہے میں ہی ہر اس شے کی اصل ہوں جو تو دیکھتا ہے۔
یہ جہان میرے طلسم کا اسیر ہے جو ہر لمحہ میرے دم سے بوڑھا ہوتا رہتا ہے
۸۸ لہ اقبال:۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۱۸۲
۸۹ لہ شاہ طہماسپ۔ ہمایوں کا ہم عصر ایران کا بادشاہ

۲؎ اقبال:- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۱۰۵

۹۰ ۱؎ اقبال:- " " " ص۱۵

۲؎ اقبال: " " ص۵۸-۵۹

۳؎ و ۴؎ اقبال: بالِ جبریل (مسجد قرطبہ)

۵؎ اقبال:- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۵، ۵۸، ۵۹

۹۱ ۱؎ اقبال: بالِ جبریل (ساقی نامہ)

۲؎ غالب - دیوانِ غالب (اردو)

۳؎ اقبال:- بالِ جبریل۔ یہ جاہلوں کا قول ہے کہ زمانہ سازبن جا، اگر زمانہ تیرا ساتھ نہیں دیتا تو اس سے جنگ کر۔

۹۲ ۱؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں:- روحِ اقبال ۱۹۶۶ء ص۳۵۷ (فٹ نوٹ)

" ایک خیال یہ ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ مگر امام رازی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے

۲؎ اب۔ Now۔ یہ وقت۔ اس وقت

"محمدؐ عربی عرش بریں پر پہنچے اور واپس آگئے۔ خدا کی قسم اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔" مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول ہے۔

(اقبال:- اسلامی الہٰیات کی تشکیل جدید ص۱۲۴)

۹۳ ۱؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں:- روحِ اقبال ص۳۶۷ بحوالہ اقبال:-

عزمِ او خلاق تقدیر حق است

روز ہیجا تیر او تیر حق است

(اس کا عزم تقدیرِ حق کو خلق کرنے والا اور روزِ جنگ اس کا تیر تیرِ حق ہے)

قرآن مجید:- وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ - (اے پیغمبر!

حاشیہ	صفحہ کا شمار

جب تم نے (میدان جنگ میں مٹھی بھر کر خاک) پھینکی تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکی۔ خدا نے پھینکی تھی (الانفال ۸: ۱۶۔ ترجمان قرآن۔ آزاد) کچھ مترجموں نے مٹھی بھر خاک کے بجائے کنکریاں لکھی ہیں اور کچھ نے یہ کہا ہے کہ جب تم نے وار کیا تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں، اللہ نے وار کیا۔ اقبال نے وار کے بجائے تیر چلانا کہا ہے — یہ جنگ بدر کا واقعہ ہے۔

۲ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :- روحِ اقبال ص۲۸۳ (فٹ نوٹ)

۹۴ ۱ مشکوٰۃ شریف (ترجمہ و مقدمہ از قلم شیخ عبدالحق محدث دہلوی) مطبوعہ دیوبند جلد اول کتاب الایمان ص۹

اسرارِ خودی (اردو)

۱۰۰ ۱ چمکا نہیں = رم ندیدہ۔ میداں میں حُر پہنچ گئے چمکا کے راہوار (انیس)

۱۰۲ ۱ اقبال کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں عمیق منشائیں لا کر اس کی قدر بلند کر دیتے ہیں۔ یہاں سبزی بیچنے والوں کی عادت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سبزیوں پر پانی چھڑک دیتے ہیں تاکہ وہ تروتازہ رہیں اور اچھے دام اٹھائیں۔ (نکلسن)

۱۰۳ (۱) مثنوی مولانا روم کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ
مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبانِ پہلوی

۱۰۴ (۱) حے = مجنوں کی محبوبہ لیلیٰ کے قبیلے کا نام

(۲) زندہ = قوی — زندہ = جان دار

(۳) انگارہ = نقش ناتمام

۱۰۵ (۱) خوانسار و اصفہان۔ ایران کے دو شہر جہاں نامور شعراء پیدا ہوئے ہیں۔

۱۱۲ (۱) دختر سردار طے = قبیلہ بنی طے کے سخی سردار حاتم کی بیٹی۔

۱۱۳ (۱) اگرچہ کفارِ مکہ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت ایذا دی تھی مگر فتح مکہ کے بعد جب فاتح کو انتقام کا حق اور قوت حاصل تھی حضورؐ نے (لا تثریب علیکم (یعنی تمہارے لیے کوئی سزا نہیں) کہہ کر سب کو معاف کر دیا

صفحہ شمار	حاشیہ
	اسی کی طرف تلمیح ہے۔ (اقبال)
	،، قرآن مجید کے رو سے یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت یوسف ؑ نے اپنے ظالم بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے کہے تھے:۔ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط (یوسف نے کہا آج کے دن تم پر (میری جانب سے) کوئی سرزنش نہیں (قرآن مجید:۔ یوسف ۱۲ : ۹۱ - ترجمان قرآن (۲) آزاد)
	(۲) تلمیح ہے استن حنانہ (بین، آہ و بکا کرنے والے ستون) کی طرف۔ مسجد نبوی میں حضور نبی کریم ؐ لکڑی کے ایک ستون سے بدن لگا لیتے تھے۔ آپ کی رحلت کے بعد اس ستون سے رونے کی آواز آیا کرتی تھی۔
۱۱۴	۱؎ حضور نبی کریم، کتاب کونین کا دیباچہ ہیں۔ جملہ عالم خادم اور وہ مخدوم ہیں
	(۲) حضرت بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۱۴۴
	۳؎ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (اور اے پیغمبر! اس حقیقت پر غور کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں— (قرآن مجید:۔ البقرہ: ۲۸ ترجمانِ قرآن (۱) آزاد)
۱۱۵	۱؎ ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۱۶۳
	۲؎ مہ۔ ریت کا تودہ جو اپنے وجود سے اپنا رزق اس طرح حاصل کرتا ہی کہ اسی کی ریت پھسل کر بھی اس کے پہلو ہی میں رہتی ہے۔ نکلسن نے اپنے انگریزی ترجمہ میں اس کا ترجمہ چاند ہی کیا ہے جو میری رائے میں صحیح نہیں کیونکہ دو چار اشعار کے بعد ہی علامہ نے چاند کو سورج کا دست نگر بتایا ہے۔
۱۱۶	۱؎ الکاسب حبیب اللہ۔ کاسب (محنت سے روزی کمانے والا) اللہ کا دوست ہے۔ (حدیث شریف)
۱۱۷	(۱) حضرت بو علی شاہ صاحب قلندر رح کے شعر مرحبا ای بلبل باغ کہن۔ از گل رعنا بگو با ما سخن

صفحہ نمبر	حاشیہ	
۱۲۰	۱؎	اَشَر = بدترین (شرارت پسند) یومِ نحسِ مستمر = بدبختی کا طویل دن
۱۲۵	(۱)	سینا = کوہ سینا - کوہ طور
۱۳۱	(۱)	عِندَہٗ حُسنُ المَاٰب - تلمیح ہے آیت قرآنی کی طرف - وَاللّٰہُ عِندَہٗ حُسنُ المَاٰب ۝ اور بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے - قرآن مجید: آل عمران - ۳ - ۱۳ — ترجمان قرآن (۱) آزاد
۱۳۳	(۱)	حضرت ابراہیمؑ کے ایمان اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی طرف اشارہ ہے -
〃	(۲)	اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنہٰی عَنِ الفَحشَآءِ وَالمُنکَرِ - یقیناً صلوٰۃ (نماز) بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے - قرآن مجید: - العنکبوت ۲۹: ۴۵
〃	(۳)	لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۝ (یاد رکھو) تم نیکی کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے - جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ (مال و دولت میں سے) جو کچھ محبوب رکھتے ہو اسے (راہ حق میں) خرچ کرو - (قرآن مجید: - آل عمران ۳: ۸۶، ترجمان قرآن (۱) آزاد)
۱۳۴	(۱)	مُلکٍ لَّا یَبلٰی = وہ ملک جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہے -
۱۳۵	(۱)	حضور نبی کریمؐ کی طرف اشارہ ہے -
	(۲)	تلمیح ہے آیات قرآنی کی طرف - وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسمَآءَ کُلَّہَا ..... اور آدمؑ نے یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے - (قرآن مجید: - البقرہ - ۲ - ۲۹: ترجمان قرآن (۱) آزاد)

سُبحٰنَ الَّذِی اَسرٰی بِعَبدِہٖ لَیلًا مِّنَ المَسجِدِ الحَرَامِ اِلَی المَسجِدِ الاَقصَا الَّذِی بٰرَکنَا حَولَہٗ لِنُرِیَہٗ مِن اٰیٰتِنَا ۝ (پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصٰے تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے، سیر کرائی اور اس لیے

صفحہ | شعر کا | حاشیہ

سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھا دیں۔ (معراج کی طرف اشارہ ہے)

(قرآن مجید: بنی اسرائیل ۱۷:۱۔ ترجمان قرآن (۲) آزاد)

۱۳۵ (۳) حضرت موسےٰؑ کے عصا اور معجزے کی طرف اشارہ ہے

(۴) حضرت عیسےٰؑ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے

۱۳۷ (۱) مرتضےٰ (پسندیدہ منتخب)، بوتراب (مٹی کا باپ)، یداللہ (اللہ کا ہاتھ) شیرِ حق (شیرِ خدا)، فاتحِ خیبر (قلعۂ خیبر کو فتح کرنے والا) ساقیِ کوثر (قیامت کے دن حوضِ کوثر پر پیاسوں کو سیراب کرنے والا۔

یہ سب حضرت علیؓ کے نام ہیں۔

۱۳۸ (۱) معجزۂ رجعتِ خورشید (عودِ شمس) کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۰ (۱) کُن = امرِ تکوین۔ وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ وہ (اللہ) جب کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے، تو (نہ تو اسے کسی مددگار کی ضرورت ہوتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی) بس وہ حکم دیتا ہے کہ ہوجائے اور جیسا کچھ اس نے حکم دیا تھا ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔

(قرآن مجید:۔ البقرہ ۲: ۱۱۲ ترجمان قرآن (۱) آزاد)

۱۴۱ (۱) خواجہؒ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ جو حضرت ہجویریؒ کے مزار پر تشریف لائے تھے۔

(۲) عہدِ فاروق۔ حضرت عمر فاروقؓ کا شاندار عہدِ خلافت۔

فاروق = فرق کرنے والا (حق و باطل میں)

۱۵۱ لہ شہر سے مراد اقبال کا لاہور ہے جہاں حضرت شیخ میاں میرؒ (۱۶۳۵ء) کا مزار ہے

۱۵۴ (۱) تشکک و اشراق۔ قدیم فلسفۂ یونان کے دو اسکول۔ مؤخر الذکر افلاطون کے فلسفے کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں میں اس کے جامع اور مرتب شیخ شہاب الدین سہروردی

مقتول تھے جن کو سلطان صلاح الدین نے علمائے وقت کے فتوے پر قتل کرا دیا تھا (اقبال)

مشائین - حکماء کا وہ گروہ جو ارسطو کا متبع ہے -

(۲) پیر تبریزی - حضرت شمس تبریزی

کمال - حضرت شیخ کمال الدین جندی

۱۵۵ (۱) آفل = غروب ہونے والا - زوال پذیر

تلمیح ہے لا احب الآفلین کی طرف - فلما جن علیہ اللیل را کوکبا

قال ھذا ربی ج فلما افل قال لا احب الآفلین ۝

پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اس (حضرت ابراہیمؑ) نے آسمان پر ایک کوکب (چمکتا ہوا) دیکھا - اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں، میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں"

قرآن مجید :- الانعام ۶ : ۷۷ ترجمان قرآن (۱) آزاد

۱۵۸ (۱) دریائے احمر = Red Sea وہ سمندر جو جزیرہ نمائے عرب کو افریقہ سے الگ کرتا ہے

۱۵۹ (۱) خط = لکیر

(۲) احرار - حر کی جمع ہے - حر بمعنی آزاد

(۳) لی مع اللہ - ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۹۲

(۴) عاشور = ماہ محرم کا دسواں دن - حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا دن، یوم غم و آلام

۱۶۰ (۱) لا تسبوا الدھر - ملاحظہ ہوں صفحات ۹۳ تا ۹۴

(۲) عبد = غلام

۱۶۳ (۱) سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے - ان دونوں کا ایمان اور حضورؐ کی ذات سے عشق مثالی ہے -

۱۶۳ (۲) آیات:- جمع ہے آیت کی۔ آیت بمعنے نشانی

(۲) اعدا۔ عدو کی جمع ہے۔ عدو بمعنے دشمن۔ خاضعین۔ سبک سر۔ ذلیل

اِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ

الشعراء۔ ۲۶: ۴